معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰ روپے فی شمارہ ۱۲ روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰ روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پچیس^۲۵ پونڈ یا چالیس^۴۰ ڈالر

بحری ڈاک نو^۹ پونڈ یا چودہ^۱۴ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ، شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ، کراچی۔

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۱۵ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع ماہ کے تیسرے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵% ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۷۰ رمضان المبارک وشوال المکرم ۱۴۲۳ھ مطابق دسمبر ۲۰۰۲ء عدد ۶

فہرست مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

گجرات کے اکشر دھام مندر پر دہشت گردوں کے وحشیانہ حملے کو ابھی لوگ بھولے نہیں تھے کہ جموں کے رگھوناتھ مندر پر بھی ان کے وحشیانہ حملے کی خبر آگئی، اس اہم اور تاریخی مندر میں زائرین اور پجاریوں کا بڑا ہجوم ہوتا ہے، دو دہشت گرد اس میں داخل ہو کر اندھا دھند فائرنگ اور بم دھماکے کرنے لگے جس میں تازہ اطلاع کے مطابق کم از کم ۱۲ افراد ہلاک اور ۴۴ زخمی ہوئے۔ ریاست جموں و کشمیر میں تشدد اور دہشت گردی عام بات ہے۔ جہاد کے نام پر وہاں عرصے سے خون خرابہ جاری ہے، آئے دن کے تشدد میں بڑا جانی و مالی نقصان ہو رہا ہے، حال ہی میں جموں و کشمیر شاہراہ پر ایک زوردار حملے اور طاقت ور بم دھماکے میں ۶ جوان ہلاک اور ۲۰ زخمی ہو چکے ہیں، خود رگھوناتھ مندر پر اسی سال مارچ میں بھی حملہ ہوا تھا، کہا جاتا ہے کہ ریاست میں امن بحال کرنے کی کوششوں کو سبوتاژ کرنے کے لئے یہ حملے کئے جارہے ہیں۔ سبب جو بھی ہو لیکن مندروں پر حملے کا یہ رجحان بڑا خطرناک اور سخت تشویش انگیز ہے، اس کو جلد از جلد ختم کرانا سب کی ذمہ داری ہے، ایسی وحشیانہ اور مذموم حرکت کا جہاد سے بھلا کیا تعلق؟ یہ تو ایک جنونی کارروائی ہے، عبادت گاہیں کسی قوم و مذہب کی ہوں، وہ ہر ایک کے نزدیک محترم و مقدس ہیں، اسلام نے ان کو ویران کرنے، ان کی حرمت و تقدس کو پامال کرنے اور ان میں رہنے والے بے قصور پجاریوں کی جان لینے کی کسی حال میں بھی اجازت نہیں دی ہے۔

اس طرح کی جنونی حرکتوں اور دہشت گردانہ کارروائیوں میں عموماً مسلمانوں کا ہاتھ ہونا بتایا اور سمجھا جاتا ہے خصوصاً جموں و کشمیر میں ہونے والے پرتشدد واقعات کا خواہ ان کے اسباب کچھ بھی ہوں ذمہ دار عام طور پر پاکستان یا خود کشمیر کی دہشت پسند تنظیموں کو قرار دیا جاتا ہے جو واقعیت سے خالی اور بعید بھی نہیں ہے، پھر مندروں پر کئے جانے والے حملوں میں مسلمانوں کی جانب نگاہ اٹھنے اور ان کو ملوث کئے جانے کی تو واقعی وجہ بھی موجود ہے، لیکن ظاہر ہے ایسے شنیع عمل کو نام کا مسلمان ہی کر سکتا ہے، ورنہ جن لوگوں پر اسلام کی اصل حقیقت اور قرآن کی صحیح تعلیم روز روشن کی طرح عیاں ہے، وہ کبھی بے گناہ لوگوں یا کسی قوم و مذہب کی عبادت گاہ پر حملہ آور نہیں ہو سکتے، کیوں کہ ان کے دین میں اس کی ادنا بھی گنجائش نہیں ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے اس کی نہایت پرزور ممانعت کی ہے، خلفائے راشدین کے طرز عمل سے بھی اس کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی کہ انہوں نے بے خطا لوگوں کو تہ تیغ کیا یا غیر مذاہب کی

عبادت گاہیں مسمار کی ہوں، مجاہدین کو خاص طور پر اس کی ہدایت کی جاتی تھی کہ عبادت گاہوں اور انسانوں کے کمزور اور بے ضرر طبقوں پر ہاتھ نہ اٹھائیں، رسول ﷺ کے دریائے عفو و کرم کے بہاؤ کو دیکھنا ہو تو فتح مکہ کے روز کے واقعات پر نظر ڈالو کہ کس طرح ان لوگوں سے جن کی تشنگی خونِ نبوت کے سوا اور کسی چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی، کہا جاتا ہے کہ اذھبوا و انتم الطلقا (جاؤ! تم سب کے لئے عفو عام ہے، تم بالکل آزاد ہو)

بلا شبہ جو مسلمان اس طرح کے جارحانہ اور دہشت گردانہ واقعات کے مرتکب ہوتے ہیں انہیں ان کی ناروا اور مذموم حرکتوں کی سخت اور عبرت ناک سزا ضرور ملنی چاہئے کیونکہ ظلم و تشدد اور شر و فساد کا خاتمہ اور امن و امان اور حق و انصاف کا بول بالا ہی اسلام کا اصل مقصد ہے، کوئی سچا اور پکا مسلمان غیر عادلانہ و غیر منصفانہ رویہ نہیں اختیار کرتا اور تعصب و تنگ نظری کی وجہ سے کسی کی بے جا حمایت اور پچ نہیں کرتا اگر اس کا عزیز یا ہم مذہب بھی کسی جرم کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ اسے بچانے کی کوشش نہیں کرتا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرے تو اس کے ہاتھ کاٹ لئے جائیں گے" قرآن مجید میں بھی تاکید کی گئی ہے کہ کسی قوم اور گروہ کی دشمنی تم کو جادہ حق سے منحرف کر کے ناانصافی کا مرتکب نہ بنائے، اس لئے نام نہاد مسلمانوں کے مندر پر حملہ کرنے یا دہشت گردی کے ارتکاب کی سزا پانے پر کسی حقیقی مسلمان کو رنج یا شکایت نہیں ہو سکتی، ان کو اس کی شکایت ہے کہ حکومت کی کوتاہی اور پولیس کی زیادتی سے چند نادانوں کی حرکتوں کا خمیازہ ان کی پوری قوم کو بھگتنا پڑتا ہے، پولیس اتنی بے رحم، سفاک، حریص اور پست ذہن کی ہوگئی ہے کہ نہ واقعات کی تفتیش کرتی ہے اور نہ ان کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے، وہ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنا دیتی ہے، اصلی مجرم کھلے عام دندناتے پھرتے ہیں اور بے گناہ لوگ پریشان کئے اور مجرم بنائے جاتے ہیں، پولیس اپنی کارگزاری دکھانے کے لئے بے گناہوں کا انکاؤنٹر کرتی اور بے قصوروں کو تختہ مشق بناتی ہے۔

اس موقع پر ہم کو دو واقعات یاد آگئے، جن کا غلغلہ ہندوستان سے باہر بھی مچا ہوا ہے، گودھرا کے واقعہ کو بڑے زور و شور سے مسلمانوں کے سر تھوپا گیا اور کہا گیا کہ انہوں نے ہی کارسیوکوں کی بوگی جلائی، لیکن جب اصل حقائق و واقعات سامنے آئے تو معلوم ہوا کہ ع ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا، ہندو پریشد اور دوسری شرپسند تنظیموں نے منصوبہ بند طور پر یہ کھیل کھیلا اور سازش رچی تھی تاکہ کارسیوکوں کے پھونک دئے جانے کی خبر کو شہرت دے کر فضا گرم کر دیں اور ہندوؤں کے جذبات بھڑکا کر مسلمانوں کے خلاف نفرت و اشتعال کی آگ لگا دیں،

جس میں ان کو مکمل کامیابی ہوئی اور دوسرے ہی دن گجرات میں مسلمانوں کا ایسا قتل عام شروع ہوا کہ بے رحموں نے عورتوں اور بچوں کو بھی نہیں بخشا، عورتوں کی عصمتیں لوٹیں، مکان اور دوکانیں نذر آتش کیں، مساجد و مقابر مسمار کئے اور اپنے وزیر اعظم کو باہر منہ دکھانے کے لائق نہیں رکھا، گجرات کے وزیر اعلی نے ان کے راج دھرم کی تلقین کو ٹھکرا کر گورو یاترا نکالی، وشو ہندو پریشد مذہبی یاترا نکال کر بی۔جے۔پی۔ کو سیاسی فائدہ پہچانا چاہتا تھا جس میں الیکشن کمشنر حائل ہوئے۔ دراصل گودھرا معاملہ کی حقیقت سب پر عیاں ہو چکی ہے لیکن ریاستی حکومت، اس کی انتظامیہ، بی جے پی اور اس کی حلیف جارحانہ تنظیموں کی ملی بھگتی اور سازش کا مقابلہ کون کرے گا، حق تو خود ہی پسپا ہے۔

دیوالی سے ایک دن پہلے نئی دہلی کے انسل پلازہ میں پولیس نے دعوی کیا کہ اس نے دو دہشت گردوں کو تصادم میں ڈھیر کر دیا، لیکن موقع واردات پر موجود ایک عینی شاہد ڈاکٹر ہری کرشنا نے اس کو فرضی واقعہ بتا کر اس کی خود مختار ایجنسی کے ذریعہ تحقیقات کا مطالبہ کیا، انہوں نے اپنے اور دہلی پولیس کے ڈی۔سی۔پی (اسپیشل سیل) اشوک چند کے درمیان ہونے والی بات چیت کو ٹیپ کیا ہے جس میں اس پولیس افسر نے ان سے فرضی تصادم والے بیان کو واپس لینے کے لئے کہا ہے، انہوں نے انسپکٹر گووند شرما کی یہ بات بھی ٹیپ کی ہے کہ وہ کہیں کہ انہوں نے کوئی بیان جاری نہیں کیا، ڈاکٹر صاحب نے دہلی ہائی کورٹ میں اپیل کی کہ انہیں پولیس پریشان کر رہی ہے، ان کو اور ان کے خاندان کے جان و مال کو خطرہ لاحق ہے، ان کے تحفظ کا انتظام کیا جائے، اپیل میں پھر اس کا اعادہ ہے کہ تصادم فرضی تھا، پولیس اپنے کو بچانے اور قتل کیس بنانے کے لئے اسے تصادم کا نام دے رہی ہے، اپنے دعوی کے سلسلے میں پولیس سے رپورٹ طلب کرنے پر ہونے والی تنقیدوں کو قومی انسانی حقوق کمیشن کے سربراہ جسٹس جے۔ایس۔ ورما نے مسترد کرتے ہوئے کہا کہ یہ رپورٹ سینیر صحافی اور پارلیمنٹ کے ممبر مسٹر کلدیپ نیر اور ایک دوسرے صحافی پرفل بدوائی کی شکایت پر طلب کی گئی ہے اور یہ کمیشن کی قانونی ذمہ داری ہے، مزید یہ کہ جب تصادم کے دوران دہشت گردوں کی ہلاکت کا معاملہ شک و شبہ کے دائرے میں آ گیا تو مفاد عامہ کے پیش نظر پولیس کے تصادم کی آزاد ایجنسی کے ذریعہ تحقیقات ہونی چاہئے لیکن پولیس حقائق کو چھپا رہی ہے اور جارحیت پسند تنظیمیں اس کی پشت پناہی اور قانونی اداروں پر جا و بیجا نکتہ چینی کر رہی ہیں، ظاہر ہے نتیجہ ان کی خواہش کے مطابق آئے گا اور پولیس دو آدمیوں کے ناحق قتل کو اپنا کارنامہ بتا کر اس پر فخر کرے گی۔

مقالات

قرآن عظیم کے سائنٹفک دلائل

از مولانا محمد شہاب الدین ندوی مرحوم☆

قرآن حکیم اصلاً دلائل و براہین کی کتاب ہے جو عالم انسانی کی ہدایت و رہنمائی کے لئے اس میں مرقوم ہیں، اور اسی بنا پر اسے "ھُدیً لِّلنَّاس" کہا گیا ہے، یعنی پوری نوع انسانی کے لئے ہدایت نامہ، اور ہدایت سے مراد اس کے وہ علمی و عقلی دلائل ہیں جو اس کے اندر موجود ہیں، اسی بنا پر فرمایا گیا "وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ" (وہ ہدایت اور حق و باطل میں فرق کرنے کے دلائل پر مشتمل ہے) اسی اعتبار سے وہ سارے جہاں کے لئے ایک "تذکرہ" اور "تنبیہ" ہے:

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (ص: ۸۷) یہ تو سارے جہاں کے لئے ایک تذکرہ ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (فرقان: ۱) بڑا ہی بابرکت ہے وہ جس نے اپنے بندے پر فرقان (حق و باطل میں فرق کرنے والی کسوٹی) نازل کی، تا کہ وہ سارے جہاں کو متنبہ کر سکے۔

نظامِ فطرت کے دلائل اب سوال یہ ہے کہ قرآن عظیم کی ہدایت و رہنمائی کے وہ دلائل کیا ہیں جو سارے جہاں کے لئے تذکیر و تنبیہ کا درجہ رکھتے ہیں؟ تو یہ دلائل و براہین یوں تو تمام علوم و فنون میں مذکور ہیں، لیکن خاص کر ان کا اطلاق نظامِ فطرت میں موجود "اشارات فطرت"(۱) پر ہوتا ہے، جن کو قرآن کی زبان میں "آیات" اور "بینات" قرار دیا گیا ہے، لفظ آیت کے لغوی معنی

☆ سابق جنرل سکریٹری فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ بنگلور۔۲۹

''واضح نشانی'' یا ''ظاہری علامت'' کے ہیں (۲) اور اس کا اطلاق حسب ذیل معانی پر ہوتا ہے:
۱۔ معجزہ ۲۔ کوئی عبرت کی بات ۳۔ علامت (یعنی نظام فطرت کا کوئی اشارہ) ۴۔ قرآنی آیت ۵۔ امرونہی یعنی احکامِ الٰہی (۳)

چنانچہ لفظاً آیت، آیات اور بینات کے الفاظ کتاب الٰہی میں نظامِ فطرت میں پائے جانے والے خدائی اشارات پر دلالت کرنے کے لئے بہ کثرت استعمال کئے گئے ہیں اور یہ اشارات یا علامات اپنی ساخت کے لحاظ سے منطقی دلائل کی بنیاد بننے کی استعداد رکھتے ہیں، جو خدا کی خلاقیت و ربوبیت، اس کی وحدانیت اور اس کی حیرت انگیز قدرت ومخلوق پروری پر دلالت کرتے ہیں، اس لحاظ سے ان کو ''دلائل ربوبیت'' کہا جا سکتا ہے، جو کائنات کی ہر چیز اور ہر مظہر فطرت میں موجود ہیں، خواہ ان کا تعلق نباتات سے ہو یا حیوانات سے، جمادات سے ہو یا اجرامِ سماوی سے، غرض دنیا کی کوئی بھی چیز دلائل ربوبیت سے خالی نہیں ہے، بلکہ کائناتِ مادی کی ہر چیز خدا کے وجود کی واضح علامت ہے، اسی لئے فرمانِ الٰہی ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَالْفُلْکِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِیْهَا مِنْ کُلِّ دَآبَّةٍ وَّ تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (بقرہ: ۱۶۴)

آسمانوں اور زمین کی خلقت وہیئت اور دن رات کی کمی بیشی میں اور ان کشتیوں (اور جہازوں) میں جو لوگوں کے فائدے کا سامان (تمدن) لے کر چلتے ہیں اور اس بارش میں جسے اللہ بادل سے برساتا ہے اور پھر اس کے ذریعہ زمین کو اس کے مردہ (خشک) ہو چکنے کے بعد زندہ (تروتازہ) کر دیتا ہے اور ان (طرح طرح کے) حیوانات میں جو اس نے روئے زمین پر پھیلا رکھے ہیں اور ہواؤں کے ہیر پھیر میں اور اس بادل میں جو زمین اور آسمان کے درمیان معلق رہتا ہے، (ان تمام مظاہر میں) یقیناً عقل مندوں کے لئے وجود باری کی نشانیاں موجود ہیں۔

دلائل ربوبیت کے سلسلے میں قرآن حکیم کی یہ ایک بہت ہی جامع آیت ہے، جس میں مختلف مظاہر ربوبیت کا تذکرہ کر کے اہل علم و دانش کو ان مظاہر میں موجود نظام فطرت کے حقائق کو

منظر عام پر لانے کی تاکید کی گئی ہے، یعنی ان مظاہر کے نظاموں میں طبیعی وحیاتیاتی نقطۂ نظر سے جو ''علمی شہادتیں'' باری تعالیٰ نے اپنے وجود، اپنی وحدت و یکتائی، اپنی زبردست قدرت وخلاقی اور اپنی ربوبیت والوہیت کے اثبات کی غرض سے رکھ چھوڑی ہیں ان کا کھوج لگایا جائے، تاکہ یہ دلائل منکرین ومعاندین پر حجت بن سکیں کہ اس پوری کائنات میں ایسی کوئی چیز یا ایسی کوئی سائنسی حقیقت موجود نہیں ہے جو شرک ومظاہر پرستی اور الحاد و مادیت کے لئے دلیل بن سکے، بلکہ یہ تمام مظاہر فطرت اپنی انوکھی صنعت و کاریگری اور اپنے عجیب وغریب نظاموں کے باعث لامحالہ طور پر ایک انوکھی اور حیرت ناک ہستی کے وجود کی خبر دے رہے ہیں، جس کے کرشموں کو انسان صحیح طور پر سمجھنے سے بھی قاصر ہے، اس لحاظ سے خدائے خلاق کے یہ انوکھے مظاہر اس کے ''تخلیقی معجزات'' کی حیثیت رکھتے ہیں جو پوری نوعِ انسانی کے لئے درسِ عبرت ہیں۔

وہ آیت جو تمام سائنسی علوم پر محیط ہے

واقعہ یہ ہے کہ یہ قرآن عظیم کی ایک بہت ہی اہم اور جامع ترین آیت ہے جس میں آٹھ قسم کے دلائل ربوبیت بیان کئے گئے ہیں، جو زمین سے لے کر آسمان تک تمام مظاہر ربوبیت پر محیط ہیں اور ان مظاہر و دلائل کی تفصیل اور ان میں موجود حقائق و معارف کے استنباط کے لئے حسب ذیل علوم کا مطالعہ ناگزیر ہے:

علمِ تخلیقِ کائنات	Cosmology	فلکیات	Astronomy
فلکی طبیعیات	Astrophysics	موسمیات	Meteorology
ارضیات	Geology	ارضی طبیعیات	Geophysics
علم جغرافیا	Geography	علم معدنیات	Mineralogy
طبیعیات	Physics	کیمیا	Chemistry
حیاتیات	Biology		

ان کے علاوہ اور بھی علوم شامل ہو سکتے ہیں جو ان آٹھ قسم کے دلائلِ ربوبیت کی تشریح و تفسیر کر سکتے ہوں، واضح رہے اوپر جن علوم کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ جدید سائنس کے بنیادی علوم شمار کئے جاتے ہیں اور ان کے ضمن میں مزید کئی علوم ان کی شاخوں کے طور پر وجود میں آچکے ہیں، اس لحاظ سے یہ آیت کریمہ تمام سائنسی علوم کا احاطہ کئے ہوئے ہے، جو اس کی جامعیت کا ایک محیر

العقول روپ ہے، ظاہر ہے کہ یہ قرآن عظیم کا ایک زندہ معجزہ ہے جو نظام فطرت سے متعلق ایسے وسیع کلیات پر مشتمل ہے جو انسانی عقل وفکر کو مہمیز لگانے اور اس کے لئے سوچ بچار کی نئی نئی راہیں کھولنے والے ہیں، اس لحاظ سے وہ اپنی نوعیت کا منفرد و یکتا کلام ہے، ان علوم و مباحث کا تفصیلی مطالعہ کئے بغیر اس آیت کریمہ کی صحیح تشریح وتفسیر نہیں ہوسکتی اور ان میں موجود خدائی اسباق و بصائر سامنے نہیں آسکتے۔

زمین اور آسمانوں میں دلائل و بینات

غرض یہ قرآن حکیم کی ایک عظیم ترین آیت ہے اور اس سلسلے میں دیگر مقامات میں جو دلائل ربوبیت مذکور ہیں وہ زیادہ تر اسی آیت کی تفصیل کے طور پر ہیں، چنانچہ اس سلسلے میں بطور نمونہ چند آیات ملاحظہ ہوں:

۱۔ زمین اور آسمانوں (اجرام سماوی) کی تخلیق اور ان کی ہیئت و ماہیت خدائے جبار وقہار کی واضح نشانیوں میں سے ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ ، اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالِمِيْنَ . (روم: ۲۲)

اجرام سماوی اور زمین کی تخلیق وآفرینش اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف اس کے وجود کی نشانیوں میں سے ہے، ان مظاہر میں اہل علم کے لئے یقیناً (وجود باری کی) نشانیاں موجود ہیں۔

چنانچہ زمین اور اجرام سماوی کی خلقت و ہیئت سے متعلق بعض خصوصیات کی تفصیل دوسرے مواقع پر اس طرح بیان کی گئی ہے، جن میں دلائل ربوبیت واضح طور پر نظر آتے ہیں:

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا ، وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰهَا ، وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ، اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَ مَرْعٰهَا ، وَ الْجِبَالَ اَرْسٰهَا ، مَتَاعًا لَّكُمْ وَ لِاَنْعَامِكُمْ ۔ (نازعات: ۲۷-۳۳)

کیا تمہارا بنانا بڑی بات ہے یا آسمان کا جس کو ہم نے بنایا ہے؟ اس کی چھت اونچی کی اور اسے (مختلف کہکشاؤں اور ستاروں کے ذریعہ) سنوارا، اس کی رات کو تاریک اور اس کے دن کو ظاہر کیا، اس کے بعد اس نے زمین کو (اس کی پوری گولائی میں) بچھایا، اس کا پانی (اسی کے سمندروں سے) اور چارا نکالا اور پہاڑوں کو (زمین کے اطراف) اچھی طرح جما دیا، (یہ سب انتظامات اس نے) تمہارے اور تمہارے چوپاؤں کے لئے سامان حیات کے طور پر کئے ہیں۔

وَ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَحِفْظًا ، ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (حٰم سجدہ: ۱۲)

اور ہم نے قریبی آسمانوں کو چراغوں سے سجایا اور اسے محفوظ بنا دیا ہے، یہ ایک زبردست اور ہمہ دان ہستی کا منصوبہ ہے۔

وَ لَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ زَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ۔ (حجر: ۱۶)

اور ہم نے آسمان میں یقیناً بہت سے بروج (کہکشائیں) بنادی ہیں اور غور سے دیکھنے والوں کے لئے انہیں مزین کر دیا ہے۔

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ، وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ، وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ، وَمَا نُنَزِّلُهٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۔ (حجر: ۱۹-۲۱)

زمین کو ہم نے (اس کی پوری گولائی میں) پھیلا دیا ہے اور اس میں مضبوط پہاڑ رکھ دئے ہیں (تاکہ وہ جنبش نہ کرنے پائے) اور اس کے اندر ہر چیز وزن کی ہوئی (۴) اگا دی ہے اور ہم نے اس کے اندر تمہارے لئے سامان معیشت رکھ دیا ہے اور ان کے لئے بھی جن کو تم (براہ راست) رزق نہیں پہنچاتے (۵)، ہمارے پاس ہر چیز کے خزانے موجود ہیں مگر ہم انہیں ایک متعین مقدار ہی میں اتارتے ہیں۔

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ، وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۔

کیا انہوں نے اپنے اوپر موجود آسمانی دنیا کا جائزہ نہیں لیا کہ ہم نے اسے کس طرح بنایا اور اسے مزین کر دیا ہے، جس میں کسی قسم کا شگاف نہیں ہے؟ اسی طرح زمین کو ہم نے پھیلا دیا ہے اور اس میں مضبوط پہاڑ ڈال دیئے ہیں اور اس میں ہر قسم کے خوش نما زوج

(ق: ۸۶) (نر و مادہ) اگا دئے ہیں؟ یہ (حیرت انگیز مظاہر اللہ کی طرف) رجوع ہونے والے ہر بندے کے لئے بصیرت اور تنبیہ (کا سامان) ہیں۔

اس سے بخوبی واضح ہوگیا کہ ان تمام آیات و بینات یا نشاناتِ الٰہی کا اصل مقصد نوع انسانی کو اپنے خالق و معبود کی طرف راغب کرنا اور اسے راہ راست کی طرف لانا ہے، تاکہ وہ گمراہیوں کے غار سے نکل کر ہدایت کی روشنی کی طرف آسکے، اس اعتبار سے زمین و آسمانوں کی خلقت و ہیئت اور ان کے اسرار و عجائب میں باریٔ تعالیٰ کی طرف رجوع ہونے والوں کے لئے بے شمار دلائلِ ربوبیت مذکور ہیں۔

اختلافِ لیل و نہار میں آیات و بینات

۲۔ زمین اور آسمانوں کی طرح دن رات کے اختلاف اور ان کے ہیر پھیر میں بھی خدائی دلائل و براہین موجود ہیں اور یہ اختلافِ ربوبیت اور اس کے بے مثال قدرتِ الٰہی کی دلیل ہیں، چنانچہ کبھی دن بڑا ہوتا ہے تو کبھی رات بڑی ہوتی ہے اور یہ دن رات تسلسل کے ساتھ ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں اور یہ عجائب زمین کی گردش کی بنا پر ظہور پذیر ہوتے ہیں، اسی طرح ہر سال کے چار موسم یعنی سردی، گرمی، خزاں اور بہار وہ سب بھی زمین ہی کی گردش کا نتیجہ ہے، واضح رہے جدید ترین تحقیقات کی رو سے زمین دو قسم کی گردشوں میں مصروف ہے: اس کی ایک گردش تو وہ ہے جو اس کے محور کے گرد ایک لٹو کی طرح ہوتی ہے اور دن رات اسی گردش کی بنا پر وقوع پذیر ہوتے ہیں، دوسرے لفظوں میں سورج اپنی جگہ پر برقرار رہتا ہے، یعنی وہ نہ تو طلوع ہوتا ہے اور نہ غروب، بلکہ زمین کا ایک حصہ سورج کے سامنے رہتا ہے اور اس کا دوسرا حصہ تاریک ہوجاتا ہے، چنانچہ اگر آپ اس کا نظارہ کرنا چاہیں تو ٹیبل پر ایک طرف ایک چراغ روشن کیجئے اور اس سے کچھ فاصلے پر ایک گلوب رکھ کر اسے گھمائیے، آپ دیکھیں گے کہ گلوب کا صرف وہ حصہ جو چراغ کے سامنے ہے وہ روشن ہے اور اس کا وہ حصہ جو چراغ کی دوسری طرف ہے وہ تاریک ہے، مگر چونکہ گلوب مسلسل گھوم رہا ہے اس لئے چراغ کی روشنی باری باری زمین کے ہر حصے پر پڑتی جارہی ہے، ایک طرف سے روشنی آرہی ہے تو دوسری طرف سے تاریکی، گویا کہ روشنی اور تاریکی ایک دوسرے کے پیچھے گرد ارض پر مسلسل لپٹی جارہی ہے، ظاہر ہے کہ یہ عجیب و غریب

مظہرِ ربوبیت ہے جو نوع انسانی کے فائدے اور اس کی راحت رسانی کے طور پر ہے، غرض سورج ہمیشہ زمین کے کسی نہ کسی حصے کو منور کرتا رہتا ہے، چنانچہ جب ہندوستان میں سورج طلوع ہو رہا ہو تو امریکہ میں وہ غروب ہوتا دکھائی دیتا ہے، جب کہ جاپان اور آسٹریلیا میں دوپہر اور افریقہ کے بعض ملکوں میں آدھی رات ہوتی ہے، نتیجہ یہ کہ سورج ہمیشہ کہیں نہ کہیں موجود رہتا ہے۔

اب جہاں تک موسموں کے اختلاف کا تعلق ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری زمین سورج کے اطراف بیضوی مدار میں گھوم رہی ہے، اس بنا پر وہ کبھی سورج سے دور ہو جاتی ہے تو کبھی قریب اور اس کا اوسطاً فاصلہ نو کروڑ تیس لاکھ میل ہے، مگر وہ سورج سے دور ہوجاتی ہے تو اس کا یہ فاصلہ پندرہ لاکھ میل بڑھ جاتا ہے، تب سردی کا موسم ہوتا ہے اور جب وہ سورج سے قریب ہوتی ہے تو اس کا فاصلہ پندرہ لاکھ میل گھٹ جاتا ہے تب موسم گرما واقع ہوتا ہے، ورنہ اگر یہ مدار بالکل گول ہوتا تو زمین کا موسم ہمیشہ یکساں رہتا اور اس میں گرمی یا سردی کا موسم بالکل نہ ہوتا، غرض زمین کی ان دو دو گردشوں کے باوجود اہل زمین کو کبھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ گھوم رہی ہے اور انہیں دھکا تک نہیں لگتا، ظاہر ہے کہ یہ سب رکھ رکھاؤ خالق عالم کی ربوبیت، اس کی مخلوق پروری اور اس کی بے مثال قدرت و رحمانیت کا نتیجہ ہے کہ دن رات کی آمد و رفت کا یہ محیر العقول نظام پوری باقاعدگی اور ضابطہ بندی کا مظہر ہے، چنانچہ سال کے بارہ مہینوں میں ان دو قسم کے نظاموں میں ایک منٹ بلکہ ایک سکنڈ کی بھی کمی بیشی نہیں ہوتی، چنانچہ آپ سورج کے نظام الاوقات کا ایک چارٹ بنائیے کہ وہ ہر سال کن کن مہینوں اور کن کن دنوں میں کس وقت طلوع اور غروب ہوتا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ سال کے کسی بھی دن اپنے وقت کے مطابق طلوع اور غروب ہوگا، صاف ظاہر ہے کہ اتنا نفیس اور بے داغ نظام بغیر کسی خالق و ناظم کے نہ تو وجود میں آسکتا ہے اور نہ برقرار رہ سکتا ہے۔

اسی طرح سورج اپنے تابع سیاروں کے ساتھ بے کراں خلاؤں میں چکر لگا رہا ہے، مگر کیا مجال ہے کہ زمین اور سورج کے ان نظاموں میں کسی بھی قسم کا فرق یا انتشار واقع ہوجائے اور سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ زمین، سورج اور دیگر سارے بھاری بھرکم ہونے کے باوجود خلاؤں میں تیر کس طرح رہے ہیں؟ (كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ) اتنے وزنی کرے گر کیوں نہیں جاتے؟ قانون تجاذب کی رو سے بھی ان کی تشریح و توجیہ ممکن نہیں ہے، کیونکہ اس قانون کی حقیقت

سائنس دانوں پر پوری طرح واضح نہیں ہو سکتی ہے، لہٰذا اس سلسلے میں صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ باریٔ تعالیٰ محض اپنی قدرت کاملہ ہی کی بنا پر ان وزنی اور بھاری اجسام کو تھامے ہوئے ہے، اس کے علاوہ اور کوئی بھی توجیہ صحیح نہیں ہو سکتی، اس اعتبار سے زمین اور اجرامِ سماوی کا وجود اور ان کا نظام و قیام وجودِ باری کی ناقابل تردید دلیل ہے۔

بہر حال دن رات کے اختلاف اور ان کے اسرار و عجائب کے بعض پہلوؤں پر حسب ذیل آیات روشنی ڈال رہی ہیں، جن میں دلائلِ ربوبیت کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔

وَمِنْ آيٰتِهِ الَّيْلُ وَ النَّهَارُ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ۔ (حٰم سجدہ: ۳۷)

دن رات اور آفتاب و ماہتاب وجودِ باری کی نشانیوں میں سے ہیں۔

وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ۔ (مزمل: ۲۰)

اللہ دن رات کا منصوبہ (نظام) بناتا ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ۔ (ابراہیم: ۳۳)

اسی نے سورج اور چاند کو تمہارے کام میں لگا دیا ہے جو ہمیشہ (ایک حالت پر) چلتے رہیں گے اور اس نے دن رات کو بھی تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِىْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ۔ (زمر: ۵)

اس نے آسمانوں اور زمین کو حقانیت کے ساتھ پیدا کیا ہے، وہ رات کو دن پر اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے، ان میں سے ہر ایک ایک مقررہ مدت تک دوڑ رہا ہے، تو جان لو کہ وہ (خالق ارض و سماء) غالب اور بخشنے والا ہے۔

اس آیت کریمہ میں صاف طور پر بتایا جا رہا ہے کہ سورج کبھی غروب نہیں ہوتا بلکہ کرۂ ارض پر دن اور رات کو باری باری لپیٹا جاتا ہے اور یہ حقیقت باریٔ تعالیٰ کی حکمت تخلیق اور اس کے بے مثال منصوبہ بندی پر دلالت کرتی ہے کہ وہ نہایت درجہ عجیب و غریب طریقے سے مخلوق پروری کر رہا ہے، اسی طرح فرمایا:۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ۔ (لقمان: ۲۹)

اے مخاطب کیا تو نے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کر دیتا ہے؟

يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِىْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ۔ (فاطر: ۱۳)

وہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور اسی نے سورج اور چاند کو تمہارے کام میں لگا دیا ہے، ان میں سے ہر ایک، ایک وقت مقررہ تک دوڑ رہا ہے، یہی ہے تمہارا رب جس کے ہاتھ میں (اس پوری کائنات کی) بادشاہی ہے اور تم جن لوگوں کو اللہ کے سوا (بطور معبود) پکارتے ہو وہ ایک گٹھلی کے چھلکے کے برابر بھی کسی چیز کے مالک نہیں ہیں۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ دن رات اور چاند سورج کا مضبوط نظام ربوبیت کے تقاضوں کے ماتحت ہے، جو حیران کن طریقوں سے مخلوق پروری کر رہا ہے، چنانچہ حسب ذیل آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تمام اجرام بشمول زمین بے کراں خلاؤں میں بغیر کسی سہارے کے تیر رہے ہیں، یعنی چکر کاٹ رہے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِىْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ۔ (انبیاء: ۳۳)

وہی ہے جس نے رات دن اور آفتاب و ماہتاب کو (محض اپنی قدرت سے) پیدا کیا، چنانچہ ان میں سے ہر ایک، ایک مدار میں تیر رہا ہے۔

باریٔ تعالیٰ کی یہ تخلیق اور اس کا منصوبہ بند نظام جو حکمتوں اور مصلحتوں سے پُر ہے، وہ بغیر کسی خالق کے از خود وجود میں آنے کا منکر ہے، ظاہر ہے کہ ایسا باضابطہ اور محیر العقول نظام محض بخت و اتفاق کے تحت ہرگز وجود میں نہیں آ سکتا، اسی لئے بعض آیات میں اسے دلیل ربوبیت قرار دیا گیا ہے۔

اِنَّ فِىْ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ۔ (یونس: ۶)

دن رات کے اختلاف اور زمین و آسمان میں اللہ نے جو چیزیں پیدا کر رکھی ہیں، ان سب میں ڈرنے والوں کے لئے یقیناً (بہت سی) نشانیاں موجود ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ، وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ،

اس نے دن رات اور چاند سورج کو تمہارے کام میں لگا دیا ہے اور ستارے بھی اسی کے حکم سے

إِنَّ فِي ذَالِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ۔ (نحل:۱۲)

مسخر ہیں، ان مظاہر میں عقل مندوں کے لئے دلائل ربوبیت موجود ہیں۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يَذَّكَّرَ أَوْ أَرَادَ شُكُورًا۔ (فرقان:۶۲)

وہی ہے (تمہارا رب) جس نے دن رات کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والا بنایا، اس کے لئے جو (اس حیرت انگیز مظاہر کے باعث باری تعالیٰ کی ربوبیت پر) متنبہ ہونا یا اس کا شکرگزار بننا چاہے۔

اس اعتبار سے آیات و بینات یا دلائل ربوبیت کو ظاہر کرنے کا بنیادی مقصد ظاہر ہے کہ ہدایت و رہنمائی کے راستے کھولنا اور نوع انسانی کے ذہن و دماغ کو صیقل کرنا ہے، تاکہ وہ اپنا باغیانہ رویہ ترک کر کے خدائے رحمان کے وجود اور اس کی خلاقیت و ربوبیت پر ایمان لا سکے۔ اسی لئے ایک دوسرے موقع پر ارشاد باری ہے:

يُقَلِّبُ اللَّهُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ، إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِأُولِي الْأَبْصَارِ۔ (نور:۴۴)

اللہ دن رات کو الٹ پلٹ کرتا رہتا ہے، اس منظر میں یقیناً آنکھوں والوں کے لئے ایک بڑی عبرت موجود ہے

الغرض زمین اور آسمانوں کے نظام اور دن رات کے ہیر پھیر میں چونکہ ایسی بے شمار دلیلیں موجود ہیں جو باری تعالیٰ کے وجود اور اس کی بے مثال قدرت و یکتائی پر دلالت کرتی ہیں اور یہ سارے سائنٹفک دلائل عصر جدید میں قرآن عظیم میں درج شدہ پیش گوئیوں یا غیبی خبروں کے عین مطابق ہیں، اس لئے قرآن عظیم رب العالمین کی جانب سے نازل کردہ سچا کلام قرار پاتا ہے، گویا کہ قرآن عظیم اپنی دلیل آپ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک موقع پر قرآن حکیم کی صداقت و سچائی کے لئے رات اور دن کی قسم کھائی گئی ہے۔ یعنی ان دونوں کو بطور شہادت و گواہ پیش کیا گیا ہے:

وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ. وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ. إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ (تکویر:۱۴_۱۶)

قسم ہے رات کی جب وہ آنے جانے لگے اور صبح کی جب وہ سانس لینے لگے۔ یقیناً یہ ایک معزز رسول کا (جبرئیل کی جانب سے لایا ہوا) کلام ہے۔

چنانچہ اس کلام کے نازل کرنے کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ عالم انسانی کو متنبہ کر سکے۔

إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ. لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَسْتَقِيمَ۔ (تکویر:۲۷_۲۸)

یہ تو سارے جہاں کے لئے ایک تذکرہ (یا تنبیہ) ہے۔ لہٰذا تم میں سے جو چاہے وہ سیدھا ہو جائے۔

سمندر کی تسخیر میں دلائل ربوبیت

۳۔ دلائل ربوبیت کی تیسری قسم سمندروں کی تسخیر ہے، چنانچہ گہرے اور اتھاہ سمندروں میں وزنی کشتیاں اور جہاز جو سامان تمدن سے لدے ہوتے ہیں وہ پانی میں ڈوبے بغیر چلتے ہیں، کیونکہ خدائے عزوجل نے اپنی رحمانیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پانی کے کچھ طبیعی اصول ایسے بنائے ہیں کہ یہ لدے ہوئے اور وزنی جہاز پانی میں ڈوبنے نہیں پاتے، چنانچہ اس سلسلے میں یونانی حکیم ارشمیدس نے کچھ اصول دریافت کئے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ باری تعالیٰ نے اگر یہ طبیعی اصول مقرر نہ کئے ہوتے تو انسان بہت مشکل میں پڑ جاتا اور سمندری سفر اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوتا، لہٰذا سمندروں کی تسخیر محض فضل الٰہی کا نتیجہ ہے جو اس کے حکم سے عمل میں آیا ہے، تاکہ انسان خدائے رحمان کا شکرگزار بنے اور اس میں انسان کے لئے بہت سے تمدنی فوائد بھی ہیں، چنانچہ اس سلسلے میں ارشاد الٰہی ہے:

اللَّهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيهِ بِأَمْرِهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔ (جاثیہ:۱۲)

اللہ وہ ہے جس نے سمندر کو تمہارے لئے پوری طرح رام کر دیا ہے، تاکہ اس کے حکم سے اس میں جہاز چل سکیں اور تم اس کا فضل تلاش کر سکو، تاکہ تم اس کے شکرگزار بن سکو۔

وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔ (نحل:۱۴)

وہی ہے (تمہارا رب) جس نے سمندر کو قابو میں کیا، تاکہ تم اس سے تازہ گوشت (مچھلیوں کی شکل میں) کھا سکو اور اس سے زیور (موتی اور مونگوں کی شکل میں) نکال سکو جسے تم پہنتے ہو، تو دیکھتا ہے کہ یہ جہاز سمندر میں پانی کو چیرتے ہوئے چلتے ہیں، (یہ مظہر ربوبیت اس لئے ہے کہ) تم اللہ کا فضل تلاش کر سکو اور اس کے شکرگزار بن سکو۔

چنانچہ ایک موقع پر باری تعالیٰ نے اس مظہر ربوبیت کو اپنی شفقت و رحمانیت اور مخلوق پروری

کا باعث قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ سمندروں میں کشتیاں چلانے والا اصلاً وہی ہے، کیونکہ اگر اس نے پانی کے وہ طبعی ضوابط بنائے نہ ہوتے جن کی وجہ سے وزنی جہاز پانی میں ڈوبے بغیر تیرتے ہوئے چلے جاتے ہیں تو انسان سمندر میں قدم بھی نہ رکھ سکتا۔

رَبُّكُمُ الَّذِیْ یُزْجِیْ لَكُمُ الْفُلْکَ فِی الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِیْمًا۔ (بنی اسرائیل:۶۶)

تمہارا رب وہ ہے جو تمہارے لئے سمندر میں کشتیاں چلاتا ہے تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرسکو، یقیناً وہ تم پر بڑا مہربان ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِی الْاَرْضِ وَ الْفُلْکَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَیُمْسِکُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ۔ (حج:۶۵)

کیا تو نے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ نے تمہارے لئے زمین کی تمام چیزوں کو مسخر کردیا ہے اور سمندر میں جہاز بھی اسی کے حکم سے چلتے ہیں اور اسی نے آسمانی اجرام کو تھام رکھا ہے کہ وہ زمین پر گر پڑیں؟ ہاں البتہ اس کے حکم سے ایسا ہوسکتا ہے، یقیناً اللہ لوگوں پر بڑا مہربان اور رحم دل ہے۔

اسی بنا پر سمندر میں کشتیوں اور جہازوں کے چلنے کو دلائل ربوبیت میں شمار کیا گیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْکَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِیُرِیَكُمْ مِنْ آیَاتِهٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ۔ (لقمان:۳)

اے مخاطب کیا تو نے مشاہدہ نہیں کیا کہ سمندر میں کشتیاں اللہ کی نعمتوں (سامانِ تمدن) کو لے کے (کس طرح) چلتی ہیں، تاکہ وہ تم کو اپنی نشانیوں کا مشاہدہ کراسکے؟ ان مظاہر میں یقیناً ہر صابر و شاکر کے لئے وجودِ باری کی نشانیاں موجود ہیں۔

بارش کے نظام میں دلائل ربوبیت ۴۔ بارش اور پانی کا نظام باریٔ تعالیٰ کی ربوبیت و مخلوق پروری اور اس کی رحمانیت کے حیرت انگیز مظاہر میں شمار کیا جاسکتا ہے، کیونکہ بارش کے پانی کا ماخذ سمندر ہیں اور سمندروں کا پانی کھاری ہوتا ہے، مگر ربِ مہربان نے اسے نہ صرف عجیب و غریب طریقے سے دور دراز علاقوں میں پہنچایا بلکہ اس کی نمکینی بھی زائل کرکے اسے میٹھا اور شیریں بنادیا، چنانچہ سائنسی نقطۂ نظر سے سورج کی گرم گرم کرنوں کی بدولت سمندر کا پانی بھاپ بن کر اوپر

اٹھتا اور ایک خاص بلندی پر پہنچ کر بادلوں کی شکل اختیار کرلیتا ہے، پھر یہ بادل ہواؤں کے دوش پر سوار ہوکر دور دراز علاقوں تک پہنچتے اور خشک زمین کو جل تھل کردیتے ہیں، اس کے نتیجے میں زمین پر روئیدگی نمودار ہوتی ہے اور وہ سرسبز ہوکر جھوم اٹھتی ہے، گویا کہ وہ مردہ ہوجانے کے بعد دوبارہ زندہ ہوگئی ہے۔

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَاءً فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ۔ (نحل:۶۵)

اور اللہ نے بادل سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعہ زمین کو زندہ کردیا جب کہ وہ مرچکی تھی، اس مظہرِ ربوبیت میں کان لگا کر سننے والوں کے لئے یقیناً ایک بڑی نشانی موجود ہے۔

اس آیت کریمہ میں ''سماء'' سے مراد بادل ہے، کیونکہ بعض دوسرے مواقع پر صاف صاف کہا گیا ہے کہ بارش بادل ہی کے ذریعہ ہوتی ہے اور اس کے لئے ''مُزْن'' اور ''مُعْصِرات'' کے الفاظ لائے گئے ہیں، چنانچہ مُزن کے معنی بادل کے ہیں اور معصرات سے مراد وہ بادل ہیں جو پانی سے لدے ہوئے ہوں اور ان سے پانی ٹپک رہا ہو، جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:۔

اَفَرَءَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ءَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ۔ (واقعہ:۶۸-۶۹)

ذرا بتاؤ تو سہی کہ وہ پانی جو تم پیتے ہو، کیا اسے بادل سے تم نے اتارا ہے یا اسے ہم اتارنے والے ہیں؟

وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَآءً ثَجَّاجًا۔ (نبا:۱۴)

اور ہم نے بادلوں سے زوردار پانی برسایا۔

اب جہاں تک بارش کے پانی کا ماخذ سمندر ہونے کی بات ہے تو یہ رازِ ربوبیت حسب ذیل آیت کریمہ سے پوری طرح فاش ہوجاتا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو اسے کڑوا یا کھاری بنادیتے، اس میں اشارہ ہے سمندر کے کھارے پن کی طرف۔

لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ۔ (واقعہ:۷۰)

اگر ہم چاہیں تو اسے کھاری بنادیں، تو تم ہمارا شکریہ ادا کیوں نہیں کرتے؟

صرف یہی نہیں کہ پروردگارِ عالم اور ربِ مہربان نے خدد درجہ حیران کن طریقے سے بارش،

برسائی اور سمندر کی نمکینی زائل کردی، بلکہ مخلوق پروری کی غرض سے اسے زمین میں ایک خاص گہرائی کے اندر محفوظ بھی کردیا، تاکہ جب بارش نہ ہو تو مخلوق خدا اس سے مستفید ہو سکے۔ گویا کہ پورے کرۂ ارض کے اندر پانی کی ''پائپ لائنس'' بچھادیں۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ فِي الْأَرْضِ۔ (زمر:۲۱)

اے مخاطب کیا تو نے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ نے بادل سے پانی برسایا پھر اسے زمین میں چشموں کی شکل میں جاری کردیا ہے؟

اگر اللہ چاہتا تو اس پانی کو زمین کے اندر دھنسا دیتا، جس کے باعث مخلوق خدا مشکل میں پڑ جاتی اور اس کا جینا دوبھر ہو جاتا مگر رب مہربان نے اپنی رحمانیت کا مظاہر کرتے ہوئے زندگی کو مشکل نہیں بنایا بلکہ نوع انسانی کی راحت کے لئے ہر طرح کے جتن کردئے ہیں، اسی لئے فرمایا گیا ہے:۔

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَأْتِيكُمْ بِمَاءٍ مَعِينٍ۔ (ملک:۳۰)

کہدو کہ اگر تمہارا پانی گہرائی میں چلا جاتا تو تمہارے لئے صاف پانی کون لاسکتا تھا؟

نیز باری تعالیٰ نے مخلوق پروری کی غرض سے آب رسانی کا ایک اور عجیب طریقہ یہ بھی اختیار کیا کہ سردی کے موسم میں اونچے اونچے پہاڑوں پر برف جمادی، تاکہ جب گرمی کا موسم شروع ہو تو وہ پگھل کر ندیوں کی شکل میں جاری ہو جائے اور اس کے ذریعہ پینے کا پانی، نباتات کی روئیدگی اور مویشیوں کے لئے چارہ مہیا ہو سکے، جیسا کہ حسب ذیل آیات میں انکشاف کیا گیا ہے:۔

وجعلنا فيها رواسي شامخات وّ أسقيناكم ماءً فراتا۔ (مرسلات:۲۷)

اور ہم نے زمین میں مضبوط پہاڑ بنادئے اور تم کو میٹھا پانی پلایا۔

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لَكُمْ مِنْهُ شَرَابٌ وَمِنْهُ شَجَرٌ فِيهِ تُسِيمُونَ يُنْبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُونَ وَالنَّخِيلَ وَالْأَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ إِنَّ فِي

وہی ہے (تمہارا رب) جس نے بادل سے تمہارے لئے پانی برسایا، اسی سے پینا ہے اور اسی کے ذریعہ درخت اگتے ہیں، جن میں تم اپنے مویشیوں کو چراتے ہو، اللہ اسی پانی سے تمہارے لئے کھیتیاں؟ زیتون، کھجور، انگور،

ذلك لآية لقوم يتفكرون۔ (نحل: ۱۰-۱۱)

اور ہر طرح کے میوے اگاتا ہے، ان مظاہر میں غور کرنے والوں کے لئے یقیناً ایک بڑی نشانی موجود ہے۔

اس طرح پانی کے ذخیرہ اندوزی دو طرح سے کی گئی: ایک زمین کے اندر اور دوسرے زمین کے اوپر پہاڑوں کی چوٹیوں پر، ظاہر ہے کہ یہ دونوں ہی قسم کے انتظامات عجیب و غریب ہیں، جو خدائی انجینئرنگ کا ایک کمال ہے، ظاہر ہے کہ حکمتوں، مصلحتوں اور مخلوق پروری کے عجائب سے پُر یہ انوکھے انتظامات بغیر کسی خالق کے خود بخود ظاہر نہیں ہو سکتے، جو چیز بغیر کسی منصوبے کے خود بخود وجود میں آجائے اس میں اس قدر تنظیم اور رکھ رکھاؤ کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ غرض ان مظاہر میں دلائل ربوبیت کی جھلکیاں صاف طور پر دیکھی جا سکتی ہیں۔

(باقی)

مراجع و حواشی

(۱) Signs of the Nature یا Natural Signs (۲) دیکھئے المفردات فی غریب القرآن، از راغب اصفہانی، ص ۱۴۱، بیروت (۳) دیکھئے قاموس القرآن، از حسین بن محمد دامغانی، ص ۶۰-۶۱، مطبوعہ دار العلم للملایین بیروت، نیز معجم الفاظ القرآن الکریم: ۱/۳/۷/۴/۷، مطبوعہ مصر (۴) یعنی کیمیائی نقطۂ نظر سے زمین سے اگنے والی ہر چیز نپی تلی ہوتی ہے اور اس کا اطلاق ''سالمات'' پر بھی ہو سکتا ہے اور نباتات کی شکل و صورت پر بھی (د) اس سے مراد بار آوری (پولینشن) کے ایجنٹ ہو سکتے ہیں، جیسے حشرات، تتلیاں، شہد کی مکھیاں اور پرندے وغیرہ۔

افغانستان
(۳)

از :- کلیم صفات اصلاحی ☆

افغانوں کی قومی مملکت ایران میں صفوی خاندان کی سلطنت دوسو سال پرانی اور روبہ زوال ہورہی تھی بالآخر مغربی افغانوں نے ایران کو فتح کرلیا مگر خالص افغانی نسل کے قبائل ھوتکی ، ابدالی اور غلزئی جو ایران ، ہرات اور قندھار میں حکمراں تھے، نادر شاہ افشار نے ان کی بساطِ سلطنت الٹ دی ، لیکن پھر بعض سیاسی مصالح کی بناپر نادر شاہ نے ابدالیوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور ان سے مصالحت کرلی (۱) اور ان کی بڑی تعداد کو اپنی فوج میں ملازم رکھ لیا اسی دوران غلزئیوں کی اکثریت سلطنت ہند کے صوبہ کابل میں پناہ گزیں ہوگئی تھی ، (۲) اس لئے نادر شاہ نے صوبیدار کابل کو لکھا کہ تم افغانوں کو کابل سے نکال دو لیکن اس نے اس پر توجہ نہ دی تو اس نے محمد شاہ کو ایران و ہندوستان کے تعلقات کا حوالہ دیتے ہوئے خط لکھا ، اس کا جواب نہ ملنے پر اس نے ۱۷۳۷ء میں قندھار و کابل کو مسخر کرکے ہندوستان پر چڑھائی کردی ، (۳) افغانستان کو زیر نگیں کرنے کے بعد اس نے پٹھانوں کے تعاون سے ہندوستان پر فوج کشی کرکے محمد شاہ پر فتح حاصل کی جس کے نتیجے میں مغلیہ سلطنت کے وہ علاقے جو سندھ کے مغرب میں تھے اور جن میں پشاور اور ڈیرہ جات وغیرہ کے اضلاع شامل تھے ، نادر شاہ کے قبضے میں آگئے ، آخر عمر میں نادر شاہ ایرانیوں سے زیادہ افغانیوں پر اعتماد کرتا تھا ، ابدالیوں کی جانب اس کا میلان اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ احمد خان ابدالی کو اس کی فوج میں کافی رسوخ حاصل ہوگیا تھا ، چنانچہ ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ کے قتل کے بعد افغانوں نے

(۱) تاریخ ہندوستان ، حصہ نہم ، شمس العلماء ذکاء اللہ مرحوم ، ص ۲۵۱ (۲) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۹۹۴ (۳) دی محمڈن ڈائنا اسٹیز ، لین پول ، ص ۲۶۰ و سیر المتاخرین ص ۱۰۳ و ما بعد

☆ اسکالر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ۔

سلطنت ایران کا طوقِ اطاعت اپنے گلے سے اتار پھینکا اور احمد شاہ ابدالی کو اپنا حاکم منتخب کرلیا ، یہیں سے ایک خود مختار سلطنت کی حیثیت سے افغانستان کی جدید تاریخ شروع ہوتی ہے ، اسٹینلی لین پول کا بیان ہے کہ بادشاہت ابدالیوں کی تھی اور وزارت ان کے رقیب قبیلہ بارک زئیوں کے سپرد ہوتی تھی ، تقریباً ایک صدی تک یہ سلسلہ چلتا رہا ، (۱) احمد شاہ کی مقبولیت اور سیاسی حکمت عملی نے پورے افغانستان کو اس کا مطیع بنادیا اور نادری سلطنت کے تمام مشرقی اضلاع دریائے سندھ تک اس کے قبضہ وتصرف میں آگئے اور جلد ہی ہرات پر بھی افغانوں کا تسلط ہوگیا (۲) تو وسیع مملکت کے جذبے سے سرشار احمد شاہ ابدالی نے متعدد بار ہندوستان پر تاخت کی اور کچھ عرصہ تک دہلی پر قابض رہا ، کشمیر ، سندھ اور پنجاب کے کچھ حصے بھی اپنی سلطنت میں ضم کرلئے لیکن رفتہ رفتہ ہندوستانی مقبوضات اس کے ہاتھ سے نکل کر سکھوں کے قبضہ میں جاتے رہے اور اٹھارہویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے سکھ پنجاب کے مالک بن گئے ، (۳) اس کی تفصیل میں پڑے بغیر مختصراً ہم صرف ان ہی واقعات کا ذکر کریں گے ، جو براہ راست افغانستان سے متعلق ہیں۔

احمد شاہ نے قندھار کو دارالحکومت بنایا اور ''دُرِّ دُرّان'' کا لقب اختیار کیا ، اس نے مملکت افغانستان میں ملکی ، فوجی ، مالی اور مدنی محکمے قائم کرکے وزراء مقرر کئے ، قندھار کا موجودہ شہر تاشقرغان اور بعض دوسرے شہر آباد کئے ، ۱۷۵۲ء میں اس نے کابل کا جنگی قلعہ تعمیر کیا ، (۴) ۱۷۷۳ء میں اس کی وفات کے وقت اس کی مملکت کا دائرہ دریائے آمو سے سندھ اور تبت سے خراسان تک وسیع تھا ، جس میں کشمیر ، پشاور ، ملتان ، سندھ ، بلوچستان ، ایرانی خراسان ، ہرات ، قندھار اور کابل تک کے علاقے شامل تھے ، مگر مفتوحہ علاقوں کی وسعت کے سبب اس کی زندگی ہی میں بعض علاقے مثلاً پنجاب اور بلوچستان وغیرہ خود مختار ہوگئے اور خراسان میں آل قاچار کی گرفت مضبوط ہوگئی ، (۵) پھر اس کے جانشینوں میں درانی سلطنت کے حصے بخرے ہوتے گئے ، احمد شاہ کے پوتے زمان شاہ نے جب بارک زئیوں کی موروثی وزارت کو ختم کرنے کی غرض سے ان کا قتل عام کرایا تو ان کی طاقت کم ہونے کے بجائے بڑھتی گئی ، محمد شاہ کی بادشاہت اور شاہ شجاع کے ابتدائی

(۱) دی محمڈن ڈائنا اسٹیز ، ص ۲۶۱ (۲) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۹۹۴ (۳) دی محمڈن ڈائنا اسٹیز ، ص ۲۶۱ و سفر نامہ افغانستان ص ۱۱۴ (۴) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۹۹۴ (۵) ایضاً ص ۱۳۴

زمانہ میں ان کی طاقت مزید بڑھ گئی اور ان کے وزراء کی منزلت وعظمت کم کرنے کی ساری کوششیں بے سود ہوگئیں حتی کہ جب ۱۸۱۸ء میں فتح خان بارک زئی کی آنکھوں میں سلائی پھیر کر اسے اندھا کر دیا گیا اور آخر میں معزول کر دیا گیا جس کے بعد درانی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا اور ۱۸۲۶ء میں دوست محمد براپہلا بارک زئی امیر تخت نشین ہوا، درانیوں کے عہد آخر میں ایرانیوں نے افغان شہزادوں کے قبضہ سے ہرات خالی کرانا چاہا اور ۱۸۱۶ء میں انہوں نے اس پر حملہ بھی کر دیا تاہم بارک زئی امیر فتح خان نے انہیں شکست دے کر پسپا کر دیا۔(۱)

بارک زئی خاندان اس قبیلہ کو محمد زئی قبیلہ بھی کہتے ہیں، اس کی نسبت ملک سدو کے ہم عصر محمد نامی شخص کی طرف ہے، اس کے اخلاف قندھار کے بارک زئی قبائل کے سردار کہے جاتے تھے، اس کے ایک فرد حاجی جمال الدین خاں احمد شاہ ابدالی کے ماتحت تھے، ۱۷۷۰ء میں ان کے انتقال کے بعد اس کے لڑکے پائندہ خان نے تیمور شاہ کا خاص تعاون کیا مگر زمان شاہ نے ۱۸۰۰ء میں اس کو قندھار میں قتل کرا دیا، اس کے متعدد بیٹوں میں فتح خان شاہ دوست کے لقب سے محمود (۲) کے کابل پر قبضہ کے بعد وزارت سے سرفراز ہوا، اس طرح محمد زئیوں کی طاقت بڑھی تو حکمراں خاندان سدوزئیوں سے ان کی مزاحمت ومخاصمت شروع ہوئی، اس تصادم سے افغانستان میں خوں ریزی کا سیلاب امنڈ آیا جس میں فتح خان کی جان چلی گئی اور اس کے بھائی دوست محمد خان نے انتقاماً محمود کو کابل سے نکال دیا، دو خاندانوں کی آپسی دشمنی کے سبب افغانستان کی مرکزی سلطنت کی گرفت ڈھیلی ہوگئی اور اس کے بیرونی صوبے اس کے ہاتھ سے نکل گئے، حتی کہ امیرانِ سندھ نے شکار پور کو مغلوب کر کے افغانی اثر ونفوذ کا خاتمہ کر دیا، اس کے بعد سدو خاندان پر زوال آگیا تاہم محمد زئی قبائل کی طاقت مجتمع ہوگئی اور قلیل مدت کے لئے امیر دوست محمد مستحکم سلطنت کا حکمراں بن کر تخت اقتدار پر جلوہ نما ہوا، اپنی انصاف پسندی کے سبب وہ افغانوں میں ہر دل عزیز بھی تھا مگر اس کے بھائیوں کی رقابتیں اس کے اقتدار پر اثر انداز ہوئیں اور پشاور میں اپنے بھائی اور رنجیت سنگھ سے مقابلہ کے وقت اسے ایرانیوں، انگریزوں اور روسیوں سے مدد لینی پڑی۔

افغانستان میں روس وبرطانیہ کی مداخلت اٹھارہویں صدی عیسوی تک افغانستان کا مغربی

(۱) دی محمڈن ڈائنا اسٹیز، ص ۳۶۱ (۲) محمود سدوزئی قبیلہ کا سردار تھا۔

حصہ ایران اور مشرقی حصہ سلطنت مغلیہ ہند کا مقبوضہ تھا تاہم مؤرخین کے بیان کے مطابق ایران میں نادر شاہ اور ہندوستان میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد افغانستان پر ان ملکوں کا اثر کم ہوتا گیا اور ایک صدی تک افغانستان شدید خانہ جنگی کا شکار رہا، اس دوران احمد شاہ ابدالی نے افاغنہ کے اندر قومی اتحاد کی جو روح پھونکی تھی اس کے اثرات دیرپا نہیں ثابت ہوئے، جلد ہی خاندانی اور قبائلی کشمکش نے ان کا شیرازہ منتشر کر دیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر عالی حوصلہ امیر آگے بڑھ کر اپنا سکہ جمانے کی کوشش کرتا، جس کے سبب اندرونی طاقت کم ہونے لگی، واضح رہے کہ اس وقت تک افغانستان بحیثیت ملک صفحۂ عالم پر نمودار ہو کر ایران وہندوستان کے قبضہ سے آزاد ہو چکا تھا، مگر اس کی خانہ جنگی کے سبب روس وبرطانیہ کی نگاہیں اس کی جانب اٹھنے لگیں، کیونکہ ایران کے ساتھ روس کے تعلقات استوار ہو چکے تھے اور ہندوستان میں برطانوی اقتدار کا آفتاب بھی طلوع ہو چکا تھا اور یہ دونوں ہی افغانستان پر تسلط کا خواب دیکھنے لگے تھے، ۱۸۳۷ء میں روس نے شاہ ایران کو ہرات پر فوج کشی کے لئے اکسایا (جو اس وقت کلید افغانستان کہلاتا تھا) لیکن دس ماہ کے محاصرے کے باوجود اس کو پسپا ہونا پڑا (۱) اور ہرات پر دوست محمد نے قبضہ کر لیا، جسے برٹش گورنمنٹ نے تسلیم بھی کیا، ہرات پر بارک زئی قبیلہ کی حکومت، برطانیہ کو اس لئے گوارا تھی کہ روس سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا، حکومت برطانیہ ہرات پر ایران کے قبضہ کو اصلاً روس کا قبضہ سمجھتی تھی اور ایران وروس کی متفقہ کارروائیوں سے برطانیہ نے محسوس کر لیا تھا کہ افغانستان میں اس کے اثرات ضرور پڑیں گے، چنانچہ برطانیہ اور امیر دوست محمد کے درمیان دوستانہ مراسم کا آغاز ہوا اور دوست محمد خان نے لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل ہند کو لکھا کہ مجھ کو اور میرے ملک کو آپ اپنا ہی تصور کریں، (۲) اس کے بعد حکومت برطانیہ کی طرف سے سفارتی گروہ تجارتی تعلقات استوار کرنے کی غرض سے کابل گیا، چونکہ امیر دوست محمد کی تخت نشینی ایسے حالات میں ہوئی تھی جب افغانستان اندرونی وبیرونی دونوں طرح کی مشکلات میں پھنسا ہوا تھا، اس لئے امیر دوست محمد نے حکومت برطانیہ سے سیاسی وتجارتی دونوں دونوں طرح کے تعلقات قائم کرنا چاہا تھا اور لکھا تھا کہ افغانوں کے علاقوں کو رنجیت سنگھ کے قبضہ سے آزاد کرانے میں وہ ان کی مدد کرے، مگر اس کی تمنا بر نہ آئی کیونکہ لارڈ نے جواباً لکھا کہ برٹش گورنمنٹ کی پالیسی

(۱) دی محمڈن ڈائنا اسٹیز، ص ۳۶۲ (۲) روس وانگلستان، سید محمد حسین موہانی ۱۸۸۸ء، ص ۳۲ تا ۳۵

غیر جانب داری پر مبنی ہے، وہ دوسری ریاستوں کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتی، اس کے نتیجے میں ۱۸۳۸ء میں امیر دوست محمد نے برطانیہ سے سفارتی تعلقات ختم کرکے روس و ایران کے ساتھ دوستانہ مراسم کی راہ اپنائی۔ (۱)

برطانیہ کا افغانستان کے خلاف اعلان جنگ انہیں ایام میں روس کا نمائندہ ویکووچ (Vikovich) بھی کابل پہنچ کر انگریزوں کے خلاف پیش قدمی پر امیر دوست محمد کو اکسانے لگا ادھر برطانیہ نے بھی دوست محمد کی اپنے سے دوری، روس سے قربت اور ہرات کے خطرناک واقعے وغیرہ کی وجہ سے گھبرا کر افغانستان کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا (۲) اور رنجیت سنگھ اور شاہ شجاع کے ساتھ معاہدہ کیا، شاہ شجاع اپنی افواج اور مسٹر میکنائن کے ساتھ افغانستان میں داخل ہوا اور دوست محمد نے شکست کھائی، (۳) اس کے بعد کابل کی حکومت شاہ شجاع کے سپرد ہوئی اور دوست محمد خاں قیدی بنا کر ہندوستان لایا گیا (۴) انگریزی فوج کے رنجیت سنگھ اور شاہ شجاع کے تعاون سے افغانستان کے اہم شہروں کو مطیع کرنے میں بھی کامیاب ہوگئی، اس فتح وظفر پر کلکتہ سے لندن تک خوشیوں کے شادیانے بجائے گئے، کابل میں انگریزی چھاؤنی بنائی گئی اور تقریباً سترہ ہزار مسلح سپاہی مقرر کئے گئے اور سرمیک لینٹن اور سر برنیز کو گورنر مقرر کیا گیا، (۵) ۱۸۳۹ء سے ۱۸۴۲ء تک افغانستان میں قتل وخوں ریزی کا بازار گرم ہونے کی وجہ انگریزی مورخین نے روس کی ریشہ دوانیوں اور فتنہ سامانیوں کو بتایا ہے، کالیر نے بھی اپنی کتاب تاریخ انگلستان میں لکھا ہے کہ یہ جنگ روس کے اندیشہ اور اس کی اشتعال انگیزی پر ہوئی تھی، (۶) ایک خیال یہ بھی ہے کہ ہندوستان کی دولت و ثروت پر قبضہ کرنے کے لئے انگریز افواج نے مشرقی سمت برما کو فتح کرکے جس طرح اسے ہندوستان کا پشتیبان بنایا تھا اسی طرح اس نے مغربی حصہ پر افغانستان کو بھی پشت پناہ بنانے کی کوشش کی تھی اور اس سلسلہ کی پہلی کوشش ۱۸۳۸ء میں کی گئی جو ۱۸۴۲ء تک جاری رہی، (۷) تاہم افغانستان میں "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی اس زمانہ میں زیادہ کامیاب نہیں ہوئی اور برطانیہ کی منظم

(۱) سرحد برطانیہ و افغانستان، ملک سید خاں، ص ۶ و ۷، اسٹیم پریس راولپنڈی (۲) دی محمڈن ڈائنا اسٹیز ص ۳۶۲ (۳) سرحد برطانیہ و افغانستان، ص ۷ و ۸ (۴) روس و انگلستان ص ۳۶ (۵) تاریخ انقلابات عالم اول ص ۵۴۳ (۶) بحوالہ روس و انگلستان ص ۳۶ (۷) تاریخ انقلابات عالم حصہ اول ص ۵۴۲

فوجیں بعض علاقوں کو چھوڑ کر نہ پورے افغانستان کو ہندوستان کی طرح اپنا باجگذار و مطیع بنانے میں کامیاب ہوئیں اور نہ افغان کے قومی، نسلی اور مذہبی اتحاد کو پارہ پارہ کرسکیں۔

برطانیہ کے خلاف افغانوں کا اعلان بغاوت جس طرح پہلے سے برطانیہ کو افاغنہ کی سرشت اور طبعی خصوصیات کا علم نہ تھا اسی طرح افاغنہ کو بھی انگریزوں کی اصل جبلت وخصلت کا پتہ نہ تھا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں میں قربت وانسیت پیدا ہونے کے بجائے ایک دوسرے سے دوری و بے اطمینانی اور بددلی پیدا ہونے لگی اور افغانوں میں اندر ہی اندر انگریزوں کے خلاف نفرت اور بغاوت کی چنگاریاں سلگنے لگیں، یہاں تک کہ ایک سال بعد نومبر میں ۱۸۴۱ء میں میکنائن اور الیگزنڈر برنز افاغنہ کے ہاتھوں مقتول ہوئے اور کابل سے ہندوستان واپس ہونے والے سولہ یا سترہ ہزار برطانوی افسران اور ان کے متبعین قتل کردئے گئے، صرف ایک شخص ڈاکٹر برائیڈن جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوا، پولوک کی فوج نے ۱۸۴۲ء میں اس قتل عام کا خوں بہالیا، تاہم اس کے بعد سے انگریزوں نے افغانستان میں عدم مداخلت کی پالیسی اپنائی اور اس کی آزادی میں مطلق نہ دخل دینے کا فیصلہ کیا۔ (۱)

۱۸۵۵ء میں امیر دوست محمد اور حکومت برطانیہ ہند کے مابین یہ معاہدہ ہوا کہ دونوں سلطنتیں باہم مل جل کر رہیں گی، ایک کا دشمن دوسرے کا بھی دشمن اور ایک کا دوست دوسرے کا بھی دوست ہوگا اور دونوں کے لئے ایک دوسرے کی حفاظت کرنا ضروری ہوگا، جب برطانوی ہند میں انگریزوں کے خلاف علانیہ بغاوت کے آثار رونما ہوئے تو پھر برطانیہ نے تجدید معاہدہ کے لئے امیر دوست محمد کو لکھا، اس کی تحریر پانے کے بعد امیر نے ہندوستان کا سفر کیا اور اس کے اور انگریزوں کے مابین پھر یہ معاہدہ پایا کہ امیر کسی کے ساتھ تعلق نہ رکھے گا اور کابل میں انگریزی وفد اس مقصد سے قیام کرے گا کہ حکومت برطانیہ کو روس و ایران کی خفیہ کارروائیوں کی اطلاع دیتا رہے گا (۲) ہربرٹ ایڈور نے اس معاہدہ کو خداداد نعمت سے تعبیر کیا ہے اور لکھا ہے کہ کابل کے اس معاہدہ کے سبب ہی پشاور، پنجاب اور تمام ہندوستان کے علاقے بچے رہے، (۳) چنانچہ ۱۸۵۷ء کے مشہور غدر میں انگریزوں

(۱) تاریخ انقلابات عالم حصہ اول ص ۵۴۲ و محمڈن ڈائنا اسٹیز ص ۳۶۳ و اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۹۹۹ (۲) سرحد برطانیہ و افغانستان ص ۱۴ (۳) لائف آف نکلسن بحوالہ سرحد برطانیہ و افغانستان ص ۱۴

پر جب نازک وقت آیا تو افغانوں نے ایفائے عہد کی اسلامی تعلیم کے مطابق ان کا مکمل تعاون کیا اور باغیوں کے خلاف انگریزوں کی حمایت میں ہندوستانیوں کے بالمقابل صف آرا ہوئے۔

۱۸۶۳ء میں دوست محمد کے انتقال کے بعد افغانستان کی تاریخ کا زیادہ تر حصہ اس کے جانشینوں کی آپسی عداوت و دشمنی سے مملو ہے، چنانچہ شیر علی خاں نے جسے اپنے بعد دوست محمد نے سلطنت کا وارث نامزد کیا تھا، اپنے بڑے بھائی اور برادر زادوں سے نبرد آزما ہوا اور ۱۸۶۶ء میں اپنے بھتیجے عبدالرحمن بن محمد افضل سے شکست کھائی اور پہلے اس کے ہاتھ سے کابل اور پھر قندھار نکل گیا تاہم اگلے سال شیر علی خان کے بیٹے محمد یعقوب نے قندھار اور کابل کو پھر اپنے والد کے زیر نگیں کردیا، میر اعظم خاں اور عبدالرحمن خاں بھاگ کر ایران چلے گئے جہاں اعظم خاں فوت ہوگیا اور عبدالرحمن کو ترکستان کے روسی حکمراں نے اپنے پاس بلالیا، اس کے بعد شیر علی پورے افغانستان کا مالک اور بادشاہ بن گیا اور ہندوستان کی برطانوی حکومت نے بھی اس کی سلطنت کو ہری جھنڈی دکھلا دیا۔ (۱)

انبالہ کانفرنس تخت نشینی کے بعد شیر علی خان اندرونی جھگڑوں سے بہت پریشان رہا، اس درمیان وہ برطانیہ سے متعدد بار امداد کا طالب ہوا مگر اس کو احساس ہوا کہ انگریز صرف اپنے ہی وعدوں کے ایفاء کو ضروری سمجھتے ہیں جن میں ان کا اپنا کوئی ذاتی مفاد ہو، ایک طرف تو وہ افغانستان کی ترقی و خوشحالی اور اس کے استحکام کے خواہاں ہیں اور دوسری طرف اس کے رقیبوں سے ہاتھ ملانے اور حکومت کے خلاف ان سے خفیہ ساز باز کرنے میں بھی انہیں کوئی تکلف نہیں ہوتا، چنانچہ ۱۸۶۹ء میں برطانیہ نے کانفرنس منعقد کی اور امیر کو تجدید عہد نامہ کے لئے لکھا (جو اس کے والد اور حکومت برطانیہ کے مابین ہوا تھا) اس سلسلے میں امیر انبالہ گیا جہاں لارڈ میو روایسرائے اور لارڈ نیپر کمانڈر انچیف موجود تھے، کانفرنس شروع ہوئی تو امیر کو عہد نامہ کا مسودہ دیا گیا جس میں ایک شق یہ تھی کہ انگریز افغانستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے بلکہ برسر اقتدار پارلیمان سے اتفاق رکھیں گے، چنانچہ اس موقع پر امیر نے برطانیہ کی عہد شکنی کا ذکر کیا اور اپنی تقریر کے دوران کہا کہ میں نے خانگی اور اندرونی مزاحمتوں سے نپٹنے کے لئے جب برطانیہ سے مدد طلب کی اور

(۱) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۱۰۰۱

سر جان لارنس اور میرے والد کے درمیان کئے ہوئے وعدہ کو یاد دلایا تو ایسے سخت وقت میں مجھے نظر انداز کردیا گیا، چنانچہ اس عہد کی تجدید کی کوئی ضرورت نہیں اور حکومت برطانیہ نے نقدی اور اسلحے سے جو مدد کی ہے وہ واپس لے لے۔ (۱)

اس کانفرنس میں امیر نے افغانستان کے اندرونی استحکام پر زور دیا، وایسرائے نے تحفہ تحائف دے کر زور ڈالا کہ کسی طرح تین ہندوستانی کونسل کابل، ہرات اور قندھار میں قائم ہوجائے مگر امیر نے اس معاملہ کو رعایا کی مرضی پر موقوف بتا کر نامنظور کردیا، مختصراً یہ کہ شیر علی اور برطانیہ کے تعلقات منقطع ہوگئے اور کابل سے انگریزی سفیر بلالیا گیا، روس نے جو موقع کی تاک ہی میں تھا میدان خالی پا کر افغانستان پر اپنا اثر ڈالنے کی پوری کوشش کی۔

کابل میں روسی اثر انبالہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد امیر کو انگریزوں کی طرف سے مزید بے اطمینانی ہوئی، انہیں ایام میں شیر علی خاں نے اپنے بیٹے یعقوب کو زندان میں ڈال دیا تو وایسرائے نے اس کی سفارش کی، اس پر امیر سخت برہم ہوا اور برہمی میں اس وقت مزید اضافہ ہوا جب سیستان کی سرحد کے بارے میں انگریزوں کی ثالثی کو امیر نے منظور کیا تو انہوں نے سیستان کی زرخیز ترین آراضی کا ایک بڑا حصہ ایران کو دے دیا، ان باتوں کی وجہ سے انگریزوں سے بددل ہوکر امیر نے روس سے تعلقات استوار کرنے کی کوشش شروع کی، (۲) چنانچہ ۱۸۷۸ء میں روسی وفد کابل پہنچا اور دونوں نے مل کر ہندوستان پر حملہ کرنے کی تدابیر پر غور کرنا شروع کردیا، انگریزوں کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے بھی میجر کیونگری کی سرکردگی میں ایک وفد امیر کے پاس بھیجا، جس کو اس نے واپس کردیا اور انگریزوں کی عہد شکنی کا حوالہ دیا۔

روس و افغانستان کے باہمی تعلقات کی استواری انگریزوں سے نہ دیکھی گئی اور انہوں نے ۱۸۷۸ء میں افغانستان سے جنگ کا اعلان کردیا اور ان کی فوج نے کابل فتح کرلیا اور جس کے بعد شیر علی مزار شریف کی طرف بھاگ نکلا اور وہیں اسی سال ۲۲ رفروری کو اس کا انتقال ہوگیا، باپ کے انتقال کے بعد جب محمد یعقوب تخت نشین ہوا تو برطانیہ اور اس کے مابین ایک معاہدہ ہوا جس کے مطابق وادی کرم اور درۂ بولان کے کچھ علاقے انگریزوں کے قبضہ میں باقی رکھے گئے اور کابل میں برطانوی

(۱) سراج التواریخ بحوالہ سرحد برطانیہ و افغانستان ص ۱۵ (۲) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۱۰۰۱

سفارت کے قیام کا معاملہ بھی طے پا گیا، چند ماہ بعد کابل میں بغاوت برپا ہوگئی اور برطانوی سفیر کیدگنری اور اس کے ارکان قتل کردیئے گئے، اس حادثے کے بعد دوبارہ جنگ چھڑ گئی تو رابرٹس نے پھر کابل فتح کرلیا اور قبائلی لشکر جس کی قیادت ملا مشک عالم اور محمد خان کررہے تھے شکست کھا گئے اور یعقوب کو گرفتار کرکے ہندوستان بھیج دیا گیا اور حکومت عبدالرحمن کو پیش کردی گئی۔ (۱)

امیر عبدالرحمان

۱۸۸۰ء میں عنان حکومت امیر عبدالرحمن کے ہاتھ میں آئی، قدرت نے ان کے اندر معاملہ فہمی، سیاسی بصیرت اور بیدار مغزی کے اوصاف خاص طور پر ودیعت کیئے تھے، وہ روس و برطانیہ کے اصل اغراض کو اچھی طرح سمجھتے تھے، ان کی حکومت کا اعلان ہوتے ہی شیر علی کا بیٹا ایوب ہرات میں لشکر ترتیب دے کر قندھار کی طرف بڑھا اور مقام میوند میں انگریزی افواج کو شکست دے کر قندھار کا محاصرہ کرلیا، امیر عبدالرحمان اس وقت کابل میں قیام امن کی کوشش میں مصروف تھا، اس سے فارغ ہونے کے بعد جنرل رابرٹس کی مدد سے ایوب کو ایران کی طرف بھگا دیا اور قندھار پر بھی عبدالرحمان کا قبضہ ہوگیا۔ (۲)

عبدالرحمن کی حکومت سے افغانستان کی تاریخ کا نیا دور شروع ہوتا ہے، اس نے اندرونی مشکلات و بیرونی مسائل کے باوجود اپنے ملک کی آزادی برقرار رکھی اور باہمی رقابتوں اور خانہ جنگیوں کو ختم کرکے افغانستان کو ایک شیرازہ میں منسلک کیا اور انگریزوں سے کہا کہ ہندو افغانستان کے تعلقات کی بہتری اس پر موقوف ہے کہ انگریز افغانستان کو اپنی سازشوں کا نشانہ بنانا ترک کردیں اور تمام برطانوی فوجیں افغانستان خالی کردیں (۳) چنانچہ انگریزوں نے حکمت عملی اور ضرورت کی وجہ سے کئی باتوں سے اتفاق کرلیا اور ۱۸۸۱ء میں تمام برطانوی فوجیں افغانستان سے نکل آئیں اور جو صلح نامہ مرتب ہوا اس میں افغانستان کے خارجی معاملات کی نگرانی برطانیہ کے اختیار میں دینے کی بات کہی گئی تاہم افغانستان کی اندرونی طاقت کے عروج کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ برطانوی اختیار کی رسی ڈھیلی ہوتی گئی اور امان اللہ خاں کے دور میں تو برطانوی اثر بالکل ہی ختم ہوگیا۔ (۴)

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے دی محمڈن ڈائناسٹیز ص ۳۶۳ و اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۱۰۰۱ و سرحد برطانیہ و افغانستان ص ۱۷ و مابعد (۲) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۱۰۰۱ (۳) سرحد برطانیہ و افغانستان ص ۱۸ (۴) تاریخ انقلابات عالم ج ۱ ص ۵۴۵

امیر عبدالرحمن کے سیاسی کارناموں میں روس و برطانیہ سے باوقار صلح کرکے افغانستان میں بیرونی مداخلت اور فوج کشی کو ختم کرنا اور اندرونی معاملات میں منتشر قبائل کو ایک نقطہ پر جمع کرنا ہے، افغانستان کے اسی انتشار و عدم اتحاد کی بنا پر روس و برطانیہ فائدہ اٹھا رہے تھے (۱) مگر امیر عبدالرحمان کے ناخن تدبیر سے اس کمزوری کا خاتمہ ہوگیا اور برطانیہ نے یہ محسوس کرلیا کہ ایک خوش حال اور آزاد افغانستان ہی روس کو اسکے منصوبوں کی تکمیل میں رخنہ ڈال سکتا ہے اس لئے زیادہ سے زیادہ افغانستان کو مالی امداد بہم پہنچائی جائے، چنانچہ برطانیہ نے کئی سو توپیں اور پانچ لاکھ روپے اور کئی ہزار بندوقوں کے علاوہ اٹھارہ ہزار پونڈ سالانہ کا مالی تعاون افغانستان کو نذر کیا اور ''خط ڈیورنڈ'' کو باہمی سرحد بنانے پر موافقت کرلی، چنانچہ برطانوی وزیر اعظم نے لارڈ رین کو لکھا کہ ''یہ زیادہ تر تمہاری ہمت اور دور اندیشی ہی کا نتیجہ ہے کہ ہماری ہندوستانی حکومت کی حفاظت کے لئے ایک عمدہ قسم کی سرحد ''افغانستان'' کی شکل میں حاصل ہوگئی''۔ (۲)

افغانستان و روس کی حد بندی

امیر عبدالرحمن افغانستان، روس اور انگلستان کے معاملات میں ماہر و تجربہ کار تھا چنانچہ ۱۸۸۱ء میں جب روسیوں نے سمرقند تک ریل کی پٹری بچھا کر بے شمار جنگجو اور خانہ بدوش لوگوں پر تسلط حاصل کیا تو امیر نے بھی حفاظت کا مناسب انتظام کرنا ضروری سمجھا، روس سے امیر کو خطرہ نہیں تھا، افغانستان کے ساتھ انگریزوں کے مقاصد وابستہ تھے، روسی خطرہ کا بہانہ کرکے انگریز روز بروز افغانستان کا ملک اپنے قبضہ میں کررہے تھے چنانچہ ۱۸۸۴ء میں جب امیر نے خاص لنڈی خانہ (سرحد خیبر) میں چھاؤنی بنا کر اپنی سرحد کی حفاظت کی اجازت مانگی تو انگریزوں نے اجازت نہ دی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں کی نیت صحیح نہ تھی، ۱۸۸۷ء میں روس اور افغانستان کی سرحدوں کا تعین ہوا اور پنج دہ کا علاقہ الگ ہوگیا، (۳) تاہم سرحد برطانیہ و افغانستان کے مصنف کے بیان کے مطابق ۱۸۸۹ء میں افغانستان و روس کی حد بندی ہوئی۔ (۴)

یورپین تہذیب اور افغانستان

کسی ملک کو محکوم بنانے کا ایک طریقہ ''پرامن مداخلت'' بھی ہے، فاتح قوم مفتوح قوم کے کلچر اور تعلیم پر اثر انداز ہو کر اور اس کی تجارت وصنعت کے فروغ دینے کے نام پر

(۱) لائف آف عبدالرحمن بحوالہ تاریخ انقلابات عالم ج ۱ ص ۵۴۵ (۲) ہسٹری آف ماڈرن یورپ از گوچ ص ۲۷ (۳) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۱۰۰۲ (۴) ص ۲۰

اس کو امداد و عطیات اور قرضے دیتی ہے اور امیر عبدالرحمن نے انگریزوں کی اس عیاری کو بھانپ لیا تھا اس لئے اس نے افغانستان میں انگریزی تہذیب و تمدن اور تعلیمی و صنعتی سرگرمیوں کے فروغ پر قدغن لگادی تھی، اس کی وجہ سے روس و برطانیہ نے اسے "غیر مہذب اور گنوار" کا خطاب دیا تھا امیر موصوف نے کہا مجھے افغانستان کو جاہل و گنوار کہلانا منظور ہے تاہم اس کی آزادی و خودمختاری کا سودا کر کے تہذیب و تعلیم حاصل کرنا گوارا نہیں، (۱) ۱۹۰۱ء میں اس کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا حبیب اللہ تخت نشین ہوا، اس کی تخت نشینی کے بعد روس و برطانیہ میں معاہدہ ہوا کہ ان میں سے کوئی بھی افغانستان کے کسی بھی حصہ کا الحاق اپنے ملک سے نہیں کرے گا، حبیب اللہ کے عہد میں فی الجملہ افغانستان میں امن قائم رہا اور تعلیمی ترقی بھی ہوئی، باپ کی روش کے برخلاف اس نے یورپ کی تہذیب و تعلیم کے لئے راستہ کھول دیا اور آہستہ آہستہ تہذیب و ترقی کے نام پر شہنشاہیت کے گماشتے افغانستان میں داخل ہونے لگے اور ۱۹۱۴ء کی جنگ کے زمانہ میں انگریزوں کی گرفت حبیب اللہ پر مزید مضبوط ہوتی گئی لیکن افغانی اس کی پالیسی کو ناپسند کرتے تھے اس لئے اس سے بیزار ہوتے چلے گئے، چنانچہ ۱۹۱۹ء میں لغمان کے قلعہ گوش میں اسے قتل کر دیا گیا۔ (۲)

افغانستان کی خودمختاری اور برطانیہ کے خلاف جنگ کا اعلان

۱۹۱۷ء میں جب زار روس کی شہنشاہیت کے خاتمہ کے بعد نئی بالشویک حکومت کا قیام عمل میں آیا تو روس کی طرف سے افغانستان کو جو خطرہ لگا رہتا تھا عارضی طور پر ختم ہوگیا کیونکہ بالشوازم ایک بین الاقوامی تحریک تھی جس کا مقصد ہی شہنشاہیت اور توسیع مملکت کا خاتمہ اور نظریاتی انقلاب لانا تھا، یہی وجہ ہے کہ ۱۹۲۱ء میں لینن نے پولینڈ کو اس کے مطالبہ سے زیادہ علاقہ دیا، اس نے فن لینڈ اور دوسری بالٹیک (Baltic) ریاستوں کی آزادی خوشی سے تسلیم کی اور افغانستان کے ساتھ بھی مراعات برتی، ایران کو اس کے غصب کردہ حقوق واپس کر دیئے، ترکی کو دوست بنایا...... اس کے سامنے شہنشاہیت کی تشکیل اور ہوس ملک گیری نہیں تھی، (۳) لیکن جلد ہی اس تحریک میں بھی نسلی برتری اور تفوق کے جذبات پرورش پانے

(۱) لائف آف عبدالرحمن از سلطان محمد خاں، بحوالہ تاریخ انقلابات عالم ج ا ص ۵۴۶ (۲) تفصیل کے لئے دیکھئے اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۱۰۰۲ و تاریخ انقلابات عالم ص ۵۴۶ و مابعد (۳) لوئی فیشر ص ۲۲۷ بحوالہ اشتراکیت اور اسلام، مسعود عالم ندوی ص ۱۲۴، مکتبہ کراچی ۱۹۴۹ء۔

لگے اور اس کے زیر اثر بڑی خوں ریز جنگیں بھی ہوئیں، تاہم افغانستان کو روس سے جو خطرات لاحق تھے وہ کچھ عرصہ کے لئے ضرور ٹل گئے تھے، ادھر امیر حبیب اللہ کے قتل کے بعد اس کے بھائی نصر اللہ خاں نے جب جلال آباد میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا تو امیر کے تیسرے بیٹے امان اللہ نے فوج کی مدد سے اس کو قید کرلیا اور خود مسند اقتدار پر متمکن ہوگیا، اس نے ۱۹۱۹ء میں تخت نشین ہونے کے فوراً بعد ہی انگریزوں کے اثرات کو پوری طرح افغانستان سے ختم کرنے کا عزم ظاہر کیا اور تمام فوج اور سرداروں کو جمع کر کے ایک نہایت پراثر تقریر کی، تقریر کے دوران والد کے قتل پر اظہار افسوس کرتے ہوئے اپنی بے نیام تلوار لے کر کہا:

"جب تک باپ کے قاتل کو سزا اور افغانستان کو انگریزی اثر سے آزاد نہ کرلوں گا، یہ تلوار نیام میں نہیں کروں گا"۔ (۱)

اس کا یہ جوش اور حوصلہ دیکھ کر عوام کا بھی حوصلہ و اعتماد بڑھا اور برطانوی حکومت سے جنگ شروع ہوئی، انگریزی فوج نے خیبر کے دہانے کے پاس ڈکہ اور سپین بولاک کے افغانی قلعہ پر قبضہ کرلیا اور کابل پر بھی جہازوں سے بمباری کی گو قندھار میں عبدالقدوس، جنوبی سرحدوں پر محمد نادر خاں اور مشرقی سمت میں قومی سرداروں نے بھی برطانیہ کے خلاف جنگ کا اعلان کو دیا تھا، (۲) تاہم افغانی فوج کو ہزیمت اٹھانی پڑی اور جولائی ۱۹۱۹ء میں سوویت یونین نے افغانستان کی خود مختاری تسلیم کرلی، اس جنگ سے امان اللہ خاں کا مقصد برطانوی تسلط سے افغانستان کو مکمل آزادی دلانا اور اس کی خارجہ پالیسی میں برطانوی دخل اندازی کو روکنا تھا، چند ماہ کی جنگ کے بعد بالآخر افغانستان و برطانوی ہند کے درمیان مصالحت کی گفت وشنید ہوئی اور ۱۹۲۱ء میں نئے معاہدے کے مطابق **افغانستان کو آزادی میسر آئی**، (۳) سرحد برطانیہ و افغانستان کے مصنف کے مطابق افغان کونسل میں بڑی حجت و مباحثہ کے بعد مصالحت کی تجویز منظور ہوئی تھی، صلح کی گفت وشنید کے لئے راولپنڈی کا انتخاب ہوا تھا جہاں ۲۶ رجولائی کو کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں افغانی وفد کے سربراہ علی احمد خاں اور برطانوی وفد کے صدر سر ہملٹن گرانٹ تھے، یہ کانفرنس ۸ راگست کو ختم ہوئی جس میں حسب ذیل باتیں طے پائیں کہ افغانستان و انگلستان میں مصالحت، افغانستان کو براہ ہندوستان

(۱) **پولیٹکل پچویشن**: ڈاکٹر عبدالغنی بحوالہ سرحد برطانیہ و افغانستان ص ۲۸ (۲) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۱۰۰۲ (۳) تاریخ انقلابات عالم ج ا ص ۵۴۸

اسلحہ لے جانے کی اجازت، افغانستان کا بقیہ الاؤنس ضبط اور آئندہ نیا الاؤنس افغانستان کو نہ دیا جانا اور چھ ماہ بعد ایک اور کانفرنس کا انعقاد، علاوہ ایک اور تحریر برطانوی حکومت کی جانب سے افغانستان کے وفد کو یہ دی گئی کہ افغانستان کو بیرونی تعلقات میں سرکاری طور پر آزاد تسلیم کرلیا گیا۔(۱)

اس وقت تک افغانستان کا حکمراں امیر کے نام سے مخاطب کیا جاتا تھا تاہم ۱۹۲۶ء میں امان اللہ نے ''بادشاہ'' کا لقب اختیار کر کے تمام حکومتوں سے خود کو شاہ برطانیہ کے ہم رتبہ اور مساوی تسلیم کرایا، آزادی کے بعد امان اللہ نے روس و برطانیہ کی رقابت سے فائدہ اٹھایا اور روس سے معاہدہ کرلیا تو اس کے جواب میں برطانیہ نے بھی افغانستان سے معاہدہ کیا (۲) اور ۱۹۲۲ء میں اعلان کیا گیا کہ برطانیہ و روس دونوں ایک دوسرے کے خارجی و داخلی معاملات میں مداخلت نہیں کر سکتے اور ایک دوسرے کی آزادی کے تمام حقوق تسلیم کریں گے۔

افغانستان کا پہلا دستور ۱۹۲۳ء میں افغانستان میں پہلا دستور اساسی مرتب ہوا جس کی رو سے اس کا اصول حکومت جمہوری قرار پایا اور پہلی مرتبہ عوام کو کاروبار حکومت میں شریک اور رائے دہی کا حق اور آزادی حاصل ہوئی اور ایک مجلس مملکت کے علاوہ متعدد منتخب شدہ ارکان پر مشتمل مشاورتی مجلسیں قائم کی گئیں (۳) ۱۹۲۳ء میں جب انتظامی دستور العمل بنایا گیا تو فوجی و عسکری نظام جدید ترین اصول کے موافق مرتب ہوا اور بیرونی ممالک سے تجارتی اور دوسری نوعیت کے تعلقات قائم ہوئے، داخلی اصلاحات کا کام بھی شروع ہوا، ملک میں چھاپہ خانے اور پریس قائم ہوئے، اخبارات نکلنے شروع ہوئے، بلدیات کا قیام عمل میں آیا، سڑکوں اور پلوں کی تعمیر ہوئی، بجلی اور فون کی سہولتیں بہم ہوئیں، پریس قائم ہوئے، کابل میں مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ)، صوبوں میں اسمبلیاں، سیاسی جماعتوں کا وجود عمل میں آیا، ناخواندگی دور کرنے کے لئے اعلیٰ تعلیم کا بندوبست کیا گیا اور حمل و نقل کے جدید وسائل کی درآمد کر کے ان کا استعمال ہونے لگا، اس طرح عوام کی رائے پر مبنی ایک آئینی و دستوری حکومت قائم ہوئی۔

۱۹۲۴ء میں تعلیم نسواں کا مسئلہ زیر غور آیا تو عوام میں ہیجان برپا ہو گیا اور لویا جرگہ نے اس

---

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سرحد برطانیہ و افغانستان ص [illegible] و اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۱۰۰۲

(۲) تاریخ جمہوریت ص ۶۷۔۳۴۷ (۳) تاریخ انقلابات عالم ج ۱ ص ۵۴۸ و تاریخ جمہوریت حوالہ مذکور

سے متعلق قوانین کو منسوخ کر دیا، (۱) اس وقت حکومت امان اللہ خاں کے ہاتھ میں تھی، انہوں نے معاشرتی و ذہنی اصلاح کے لئے جبر کا طریقہ اختیار کیا اور اپنی اصلاحات زبردستی لوگوں پر تھوپنی چاہی اور اپنی طاقت و اقتدار کے نشہ میں عوام کے منتخب کردہ لیڈروں سے بھی رائے مشورہ لینا ضروری خیال نہیں کیا اس لئے ان کو عوام کی برہمی اور غیظ و غضب کا سامنا کرنا پڑا۔

۱۹۲۸ء میں امان اللہ خاں نے یورپ کے ملکوں کا دورہ کر کے ان سے سیاسی، علمی، ثقافتی اور اقتصادی معاہدے کئے اور افغانستان کو صنعتی ترقی سے ہم کنار کرنے کی سعی کی، (۲) مگر ان کی غیر موجودگی میں انگریزی حکومت کی شہ (۳) پا کر بچہ سقا نے کابل پر قبضہ کرلیا اس لئے اس کو قندھار کی طرف کوچ کرنا پڑا اور جب وہاں سے اس نے کابل کی حصولیابی کی دوبارہ کوشش کی تو بچہ سقا کے حامیوں نے اس کی کوششوں کو ناکام بنا دیا، ۱۹۲۹ء میں اس کو افغانستان چھوڑنا پڑا، اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ امان اللہ خاں کے خلاف آتش بغاوت بھڑکانے میں برطانوی ہاتھ پوری طرح سے کام کر رہا تھا۔

دوسرا دستور امان اللہ خاں کے افغانستان چھوڑنے کے بعد ملک میں ابتری پیدا ہوگئی، اس پر قابو پانے کے لئے جنرل نادر خاں جنہوں نے استقلال افغانستان میں نمایاں خدمات انجام دی تھیں افغانستان آئے اور انہیں ہندوستان کے برطانوی خزانے سے ساڑھے سات سو پونڈ بلا سود قرض اور اسلحے دئے گئے، (۴) انہوں نے بغاوت فرو کر کے افغانی قوم کو امن و اتحاد کی دعوت دی اور اعلان کیا کہ حکومت کے متعلق فیصلہ قومی نمائندوں کی رائے پر کیا جائے گا، چنانچہ ۱۲/اکتوبر ۱۹۲۹ء میں لویا جرگہ (قومی نمائندوں) نے نادر خان کی بادشاہت کا اعلان کیا۔(۵)

نادر خان کے بادشاہ ہونے کے بعد ۱۹۳۰ء میں افغانستان کا دوسرا دستور بنایا گیا جس کے مطابق عوام کو شخصی آزادی اور جانی و مالی و معاشی تحفظ کی ضمانت دی گئی اور ان کے قانونی حقوق و فرائض

---

(۱) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۱۰۰۳ (۲) ایضاً (۳) کیونکہ اس دورہ میں امان اللہ خاں نے ماسکو کو خاص اہمیت دی تھی جسے انگریز اپنے لئے خطرہ تصور کرتے تھے۔ (۴) پوسٹ وار ورلڈ از جیکسن بحوالہ تاریخ انقلابات عالم اول ص ۵۵۰ (۵) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۱۰۰۳ و انقلاب افغانستان میں بھی اس کی تفصیلات موجود ہیں۔

کا تعین بھی کیا گیا، دستور کے مطابق بادشاہ یعنی صدر مملکت کابینہ کے توسط سے حکومت کرنے کا مجاز ہوگا، صدر ہی وزیر اعظم کا انتخاب کرے گا، پارلیمنٹ بادشاہ اور دو ایوانوں مجلس شوری ملی اور مجلس اعلیٰ اعیان پر مبنی و مشتمل ہوگی، مجلس شوری کے ارکان کا انتخاب رائے عامہ سے ہوگا، گو قانون سازی کا اختیار اسی مجلس کو ہوگا جو رائے و مشورے سے طے کئے جائیں گے، مجلس اعیان کے تمام ممبران کی نامزدگی بادشاہ کرے گا، دستور میں یہ بھی طے کیا گیا کہ شریعت پر مبنی عدالتی نظام قائم کیا جائے گا، (۱) اس طرح افغانستان میں جمہوری طرز کی حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا۔

اسی سال روس کی شہ پر قطغن میں ابراہیم لقی اور گردیز میں دری خیل نے شورش برپا کی تو افغانی فوج نے ان بغاوتوں کو فرو کیا، پھر ۱۹۳۱ء میں جب غزنہ میں سلیمان خیل قبائل بغاوت پر آمادہ ہوئے تو انہیں بھی عسکری زور سے دبایا گیا، بچہ سقا کے کابل پر قابض ہو جانے سے جو مدارس و مکاتب بند ہو گئے تھے اب پھر کل گئے، دارالفنون کے نام سے ایک اور درسگاہ بھی قائم ہوئی نادر خان نے فوجوں کو منظم کیا اور ہر شعبہ میں اصلاح کر کے ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کی پوری کوشش کی، ان کو علوم و فنون سے خاص دلچسپی تھی، ان کے عہد میں علمی و تعلیمی ترقی بام عروج پر پہنچ گئی، تعلیم کی جانب ترغیب و تشویق دلانے کے لئے بادشاہ خود سندیں تقسیم کرتا تھا، قصر دلکشائے میں جو مدت سے افغانی بادشاہوں کی رہائش گاہ ہے ایک تعلیمی تقریب کے دوران کسی نے گولی مار کر اسے شہید کر دیا۔

تعلیم سے غیر معمولی شغف کی بنا پر ۱۹۳۳ء میں نادر شاہ کی دعوت پر علامہ سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر علامہ اقبال اور ڈاکٹر سر راس مسعود اصلاح نصاب اور علمی و تعلیمی مشورہ کے لئے افغانستان تشریف لے گئے تھے، اس ملاقات کے دوران ان حضرات سے افغانستان کی ترقی و خوشحالی پر گفتگو کرتے ہوئے نادر شاہ نے فرمایا:۔

''میری کوشش ہے کہ افغانستان میں دین و دنیا دونوں کو جمع کروں اور ایک ایسے اسلامی ملک کا نمونہ پیش کروں جس میں قدیم اسلام اور جدید تمدن کے محاسن یکجا ہوں، پھر فرمایا ۔۔۔ کہ میں افغانستان کو افغانوں کا صرف ملک نہیں بلکہ مسلمانوں کا ملک سمجھتا ہوں،

(۱) تاریخ جمہوریت ص ۲۷۴ و کتب سیاسیہ، افغانستان الحدیثہ ص ۴۰

ہمارے مسلمان بھائی بھی اس ملک کو اپنا ملک سمجھیں''۔(۱)

نادر شاہ کے یہ الفاظ ان کے صحیح اسلامی جذبے کی غمازی کرتے ہیں، ۸ نومبر ۱۹۳۳ء میں ان کے قتل کے وقت کابل میں صرف ان کے تیسرے بھائی محمود خاں وزیر دفاع موجود تھے انہوں نے نادر شاہ کے بیٹے ظاہر شاہ کی بادشاہت کا اعلان کر دیا، مسند صدارت پر ہاشم خاں فائز تھے، ۱۹۴۶ء تک امور سلطنت کی باگ ڈور ان ہی کے پاس تھی، اس درمیان ۱۹۳۵ء میں علی زئی قبائل، ۱۹۳۷ء میں جدران اور مہمند قبائل اور ۱۹۴۳ء میں صافی و مہمند قبائل کی بغاوتیں پوری قوت سے دبا دی گئیں اور فوجی، تعلیمی اور اقتصادی ترقیات کی تدابیر پر عمل درآمد کی کوشش کی گئی، ۱۹۳۴ء میں افغانستان "League of Nation" (جمعیۃ الاقوام) کا رکن بنا، ۱۹۳۶ء میں روس کے ساتھ تجارتی معاہدہ ہوا، ۱۹۳۷ء میں ترکی، عراق اور ایران سے ہونے والے میثاق پر سعد آباد میں دستخط ہوئے، دوسری عالمی جنگ میں افغانستان غیر جانب دار رہا، ۱۹۴۷ء میں سرحدی تنازعات بھی ختم کئے گئے۔(۲)

افغانستان، روس دوستی اور چند اہم معاہدات

سوویت یونین شروع سے محکوم اقوام عالم کی آزادی و خود مختاری اور انصاف و مساوات کا علم بردار ہے، اس کی یہ پالیسی بھی تھی کہ دوسرے ملکوں اور قوموں کے اندرونی و داخلی معاملات میں کسی اور قوم و ملک کو مداخلت کا کوئی حق نہیں، یہی وجہ ہے کہ سوویت حکومت نے سب سے پہلے افغانستان کی آزادی و خود مختاری کو سرکاری سطح پر تسلیم کیا اور برطانیہ جو ہندوستان جیسے عظیم ملک کے علاوہ افغانستان پر بھی اپنا پنجہ گاڑ چکا تھا، اس کے خلاف جب افغانستان میں شورش برپا ہوئی تو افغانوں نے روس سے دوستی کی پینگیں بڑھائیں اور اس نے بھی برطانوی استعمار کے خلاف افغانستان کی جدوجہد میں پورا تعاون کیا، امان اللہ خاں کے زمانہ ہی میں روس سے افغانستان کی دوستی کا آغاز ہو چکا تھا، اسی قدیم دوستی کے پیش نظر ۱۹۶۰ء میں صدر نکیتا خروشچوف نے افغانستان کا دورہ کر کے ایک طویل مشترکہ سوویت افغان اعلامیہ جاری کیا، دونوں حکومتوں میں باہمی مفاہمت اور کلیدی بین الاقوامی مسئلوں بالخصوص جنوبی مشرقی ایشیا کی صورت حال پر تبادلۂ خیالات ہوا، اس اعلامیہ میں اس بات پر خاص طور پر زور دیا گیا کہ فوجی گروہ بندیاں

(۱) سفرنامۂ افغانستان ص ۴۲، (۲) مذکورہ تفصیلات اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۱۰۰۳ و ۱۰۰۴ سے ملخصاً ماخوذ ہیں

استحکام امن میں کسی طرح معاون نہیں ہوسکتیں، چھوٹی بڑی قوموں کی مشترکہ کوششوں اور مختلف ملکوں کے باہمی تعلقات سے ہی پائدار امن کے قیام میں مدد مل سکتی ہے، فریقین نے اس بات پر بھی اتفاق کیا کہ اختلافات کی دیواریں پر امن گفت وشنید سے گرائی جائیں، دونوں ملکوں نے ہلاکت خیز ایٹمی ہتھیاروں کی پابندی پر اتفاق یہ ، دونوں کے مابین تہذیبی و معاشی تعاون پر بھی زور دیا گیا۔(۱)

سوویت یونین اور افغانستان کے درمیان تہذیبی و ثقافتی تعاون بڑھانے کے لئے جو خاص معاہدے ہوئے، ان کی درج ذیل دفعات پر افغانستان کی شاہی حکومت اور سوویت یونین نے مصالحت کی۔

دفعہ ۱۔ دونوں فریقین فنون لطیفہ اور سائنسی و ادبی تنظیموں اور انجمنوں کے درمیان تعاون کی ہمت افزائی کریں گے۔ دفعہ نمبر ۲۔ میں ۸ رنکاتی **منصوبوں** میں تعاون پر اتفاق ہوا جس میں کلچرل، سائنس اور کھیل کے وفود کا تبادلہ، سائنس اور آرٹ کی نمائشوں کا انتظام، لکچرز اور عام دستاویزی اور سائنسی فلموں اور نشریاتی پروگراموں کی ترتیب کا تبادلہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔(۱)

روس کی افغانستان میں مداخلت اور اس کا انجام افغانستان اور روس کے درمیان ہونے والے دوستی کے معاہدے کے خلاف برطانوی استعمار، امریکہ کے سیاسی اور مذہبی حلقوں میں اضطراب و بے چینی کی لہر دوڑ گئی، حکومت برطانیہ سوویت روس کی افغانستان پر گرفت اور دوستی کو اپنے لئے خطرہ سمجھ رہی تھی کہ مبادا روس افغانستان کی دولت وثروت اور معدنی ذخائر پر قبضہ نہ کرے اور امریکہ کا خیال یہ تھا کہ اس طرح روس دراصل بحر ہند پر قبضہ کرنا چاہتا ہے، اس سے اس خطے میں اس کا اثر ورسوخ بہت بڑھ جائے گا اور ہمارے اثرات بالکل ختم ہوجائیں گے، افغانستانی عوام بنیادی طور پر مذہب پسند ہیں اور کمیونزم کی بنیاد مذہب دشمنی اور خدا بیزاری پر ہے اس لئے افغانی حکومت کی روس نواز پالیسی سے وہ ہمیشہ متنفر رہے جس کی وجہ سے اس کو سخت مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا، عوام میں بہت سے قائدین اور لیڈر بھی تھے، جن کی گرفت عوام پر نہایت مضبوط تھی اس کے مقابلے میں ارباب اختیار کا اثر عوام پر بالکل نہ تھا دوسری طرف روس اپنے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کرنے کے عہد پر قائم نہ رہا اور وہ مذہبی عناصر کے مقابلہ میں افغانستان کی روس نواز حکومت کو فوجی کمک پہنچانے لگا۔

---

(۱) سوویت یونین، مشرق کی قوموں کا سچا دوست ص ۲۶۱ تا ۲۶۳ (۲) ایضاً ص ۲۶۴، ۲۶۵

اس زمانے میں روس کے اثرات بڑھنے لگے تھے، مشرق اوسط کی بغل میں بحیرۂ احمر کے مغربی کنارے مصر، سوڈان اور ایتھوپیا سے ہیل سلاسی کی امریکہ نواز شہنشاہیت کے خاتمہ اور ایرانی انقلاب کے بعد ان ممالک میں کمیونسٹ حکومتیں قائم ہونے لگی تھیں اور ۱۹۷۰ء سے جنوبی یمن پر بھی کمیونسٹوں کا قبضہ تھا، جس طرح خلیج کے تمام اہم آبی راستوں پر سوویت یونین کے سیاسی غلبے اور فوجی تسلط کا دائرہ وسیع ہو رہا تھا، ان حالات میں امریکی تجزیہ نگاروں کا خیال تھا کہ اگر سوویت یونین کا اقتدار اسی طرح بڑھتا رہا تو وہ خلیج کے سمندروں پر قبضہ کرکے امریکہ کو دنیا کے سب سے اہم خطے سے باہر نکال دے گا،(۱) چنانچہ امریکہ نے روسی اقتدار و قوت کو کم کرنے کے لئے افغانستان میں روس کے خلاف جاری مزاحمتی جدو جہد میں بڑا تعاون کیا اور نتیجتاً روس کو افغانستان ہی میں شکست نہیں ہوئی بلکہ وہ بالکل ہی بکھر گیا اور اس کی ساری ریاستیں اس سے علحدہ اور خودمختار ہوگئیں اور اب عالمی سیاست کے منظر نامہ پر امریکہ ہی واحد سپر پاور کی حیثیت سے باقی رہ گیا ہے۔

افغانستان پر سوویت حملہ کمیونسٹ نواز حکومت کے خلاف افغانستان میں گوریلا مجاہدین نے جنگ شروع کی تو برسر اقتدار پارٹی نے اپنی منظور نظر حکومت سوویت یونین کو اپنی مدد کے لئے بلایا، جس سے ۱۹۷۸ء میں اس کا یہ معاہدہ ہوا تھا کہ معاشی وتجارتی تعاون کے ساتھ ساتھ افغانستان کی آزادی اور سالمیت کو لاحق خطرے کی صورت میں فوجی مدد بھی لی جاسکتی ہے،(۲) چنانچہ ۲۷ ردسمبر ۱۹۷۹ء میں سوویت نے ایک لاکھ دس ہزار فوج کے ذریعہ سوویت نواز کمیونسٹ حکومت کی مدد کی اور افغانستان پر حملہ کردیا اور اور وہاں کی سوویت نواز اور سوشلسٹ حکومت کا تختہ پلٹ کر صدر ریاست امین اللہ حفیظ کو قتل کردیا اور خالص اپنی مرضی کے کمیونسٹ لیڈر ببرک کارمل کو کابل کی حکومت کا سربراہ بنادیا۔(۳)

امریکی اور سوویت پالیسی کیپٹلزم اور کمیونزم کے علم بردار امریکہ اور سوویت یونین بظاہر دو متحارب نظام ہائے زندگی کے پابند ہیں لیکن اس لحاظ سے دونوں کے مقاصد ایک ہیں کہ وہ اپنے ملکوں کو مادی خوش حالی وترقی دینے کے لئے دوسری قوموں کا استحصال کرنا چاہتے اور اپنی بالادستی

---

(۱) سوویت یونین کا زوال ص ۱۰۴ (۲) افغانستان کے واقعات، ہندوستانیوں کی نظر میں ص ۴۵

(۳) سوویت یونین کا زوال ص ۱۰۴

ساری دنیا کے ملکوں پر قائم رکھنا چاہتے ، خود جمہوریت کے خیر و برکت سے فیض یاب اور دوسروں کو محروم رکھنا چاہتے ہیں ، امریکی جمہوریت اور آزادانہ معیشت کے طریقے پر اندرون ملک تو سختی سے عمل پیرا ہیں مگر ان کی خارجہ پالیسی اس سے بالکل مختلف ہے ، وہ غیر ممالک کے تئیں کسی اصول کو روا نہیں رکھتے اور بین الاقوامی محاذ پر علانیہ اپنے مفادات کی جنگ کراتا ہے ، اس کے برعکس سوویت یونین اپنے عزائم کو نظریاتی رنگ دے کر اپنے عیوب کی پردہ پوشی کر رہا ہے ، بیس سال قبل جب سوویت یونین نے مادی ترقی و خوش حالی اور سائنس وٹیکنالوجی میں برتری کے ذریعہ دوسری اقوام پر غلبہ کو اپنا مقصد قرار دیا تو مارکسی نظریات اور اس کی فلسفیانہ تاویلات کا چہرہ کھل کر سامنے آیا ، لیکن امریکہ اور اس کی حلیف طاقتیں اس وقت تک اس میدان میں اس سے کافی آگے نکل چکی تھیں ، سوویت یونین کے پاس کوئی دوسری دفاعی لائن بھی نہیں تھی ، مارکسی نظریہ نے مذہب اور روحانیت کو غیر ضروری سمجھ کر انسانی زندگی ہی سے نکال دیا تھا ، چنانچہ اب اس کے پاس کوئی ایسی جائے پناہ نہیں تھی جہاں وہ اپنے منتشر شیرازہ کو متحد کرتا ، کمیونزم نے انسان کو روحانیت سے محروم کر کے اس حقیقت کو بھلا دیا تھا کہ دیرپا غلبہ کے لئے روحانی قوت کا سہارا ضروری ہے ، چنانچہ ۱۹۸۳ء کے آتے آتے افغانستان میں کمیونزم نے بھی دم توڑ دیا ، جس کا فائدہ امریکہ کو ہوا ، اس نے افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف مسلح جہادی کوشش کو پورا تعاون کیا۔

چونکہ افغانستان سے روسی افواج کے انخلاء میں امریکہ کا نمایاں ہاتھ رہا ہے اس لئے اس کی پالیسی پر گفتگو کرنی پڑی تاکہ صحیح صورت حال سامنے آجائے۔

افغانوں کا جذبۂ جہاد اور روسی فوجوں کا انخلاء

۱۹۷۹ء میں اقتدار کی باگ ببرک کارمل کے ہاتھ میں تھی اس کو تحفظ دینے کے لئے سوویت یونین کی سرخ فوج نے افغانستان پر حملہ کیا تھا ، اس کے حملے سے قبل ہی کمیونسٹ نواز حکمرانوں کے خلاف مسلح جدوجہد شروع ہو چکی تھی ، روسی فوج کے حملے نے مجاہدین کے اندر نئی روح پھونک دی ، چنانچہ ان کے جذبۂ جہاد اور ان کی روایتی حریت پسندی کے سامنے سوویت یونین کی فوجیں ٹک نہ سکیں اور سوویت یونین کو اپنی ۶۳ سالہ تاریخ میں اس طرح کی شرم ناک صورت حال کا سامنا کبھی نہیں کرنا پڑا تھا ، کالڈیپ نیر اپنی رپورٹ آف افغانستان میں رقم طراز ہیں :۔

"روسیوں کو تقریباً (افغانستان کے) ہر مقام پر مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا ، مشرق میں صوبہ ننگر ہار کے صدر مقام جلال آباد میں شدت کی لڑائی ہو رہی تھی ، یہ وہ مقام ہے جہاں اسلامی اتحاد نے مجاہدین کی تربیت کی ہے ...... لیکن ماہی پار درہ کی مشکل اور سردرہ سے فوجی کمک حاصل کر کے وہ صرف اس قابل ہو سکے کہ شہر پر دن کے وقت قبضے کا دعوی کر سکیں"۔(۱)

غرض آزادی اور جذبۂ جہاد سے سرشار مجاہدین نے ابتداء میں نہایت معمولی ہتھیاروں سے اس فوجی یلغار کا مقابلہ کیا ، سوویت اقتدار کو ایسی شدید مزاحمت کا کوئی خیال بھی نہ تھا ، وہ سمجھتا تھا کہ "یہ چند سرپھرے لوگ ہیں جو افغانستان کی ترقی و خوش حالی میں رخنہ انداز ہو رہے ہیں ، ایک مہینہ میں ان کی سرکوبی کر دی جائے گی اور چھ ماہ بعد افغانستان کی سرزمین سے ان کا نام و نشان مٹ جائے گا اور پاکستان کو بھی مجاہدین کی اعانت سے باز رہنے کی تاکید کی گئی"۔(۲) لیکن ایک سال کے بعد مجاہدین کی تحریک مزاحمت کو پہلے سے کہیں زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی چند کمیونسٹ ملکوں کو چھوڑ کر اور پورا عالم اسلام اور مغربی دنیا نے سوویت یونین کی اس کھلی جارحیت پر سخت احتجاج کیا ، ایک سال کے اندر تیس لاکھ افغان باشندے سوویت بم باری اور مظالم سے تنگ آکر پڑوسی ملکوں میں پناہ گزیں ہوئے ، تاہم مجاہدین کے آہنی جذبۂ جہاد کے سامنے عوام کی یہ قربانیاں بالکل ہیچ تھیں اور انہوں نے اپنی جان جیسی متاع عزیز کا نذرانہ کچھ اس والہانہ انداز میں پیش کیا کہ دنیا کی اس زمانے کی ایک بہت بڑی جنگی قوت بے بس نظر آنے لگی اور ۸۲-۱۹۸۱ء-۱۹۸۰ء میں سوویت حکومت کے ردعمل سے بے نیاز ہو کر مجاہدین افغانستان نے اپنی سرزمین کو سرخ فوجوں کے خون سے لالہ زار بنا دیا۔

۱۹۸۲ء میں افغانستان کی گوریلا جنگ کی ایک دستاویزی فلم بنائی گئی جس نے پورے عالم پر یہ ثابت کر دیا کہ ایک گہرے جذبۂ صادقہ کے بغیر معمولی ہتھیاروں سے سائنسی دنیا کے جدید ترین اسلحہ کی حامل ، اعلی تربیت یافتہ فوج کا مقابلہ ممکن ہی نہیں ہے ،(۳) اس کے علاوہ مغربی جنگی ماہرین

---

(۱) Report of Afghanistan ص ۱۳ بحوالہ سوویت یونین کا زوال ص ۱۱۸ (۲) New Times Moscow Feb.to Dec. 1980 بحوالہ سوویت یونین کا زوال ص ۱۱۹ (۳) A Hitch or two in Afghanistan, London 1983 & Game Plan 1986 , New York بحوالہ سوویت یونین کا زوال ص ۱۲۱

کے لئے سب سے زیادہ حیرتناک بات یہ تھی کہ قبائلی معاشرے کے افراد نے سوویت فوج کے متروکہ ومقبوضہ اور امریکہ کے فراہم کردہ جدید ترین اسلحہ کے صحیح اور فنی تکنیک کے مطابق استعمال میں کوئی دقت اور پریشانی محسوس نہیں کی۔(۱)

بہرحال امریکہ اور پاکستان کی مالی اور عسکری اعانت اور اپنے خالص دینی وجہادی جذبہ کی طاقت سے افغانستان کے مجاہدین نے روس کو شکست فاش دی۔ ۱۹۸۷ء میں ببرک کارمل کے بعد نجیب احمد صدر حکومت بنے، ان کی قیادت میں مجلس شوریٰ بنی اور ۱۹۸۹ء میں تقریباً ۱۲/سال بعد روس فوجی انخلاء کے لئے تیار ہوگیا، نجیب نے اللہ کمیونسٹوں کو دیس نکالا دیا اور ۱۹۹۲ء میں افغانستان روس جنگ بندی کا اعلان ہوا اور اقتدار مجاہدین اور افغانیوں کے ہاتھ میں آگیا، اقوامِ متحدہ کی نگرانی میں انتخاب عمل میں آیا۔

روس سے آزادی کے بعد روسی فوج کے انخلاء اور حصولِ حریت کے بعد جو لوگ افغانستان کی قیادت اور رہنمائی کے لئے آگے بڑھے ان میں پروفیسر برہان الدین ربانی کا نام سرفہرست ہے۔

انہوں نے کمیونسٹوں کے خلاف شمالی افغانستان میں بارہ سال تک منفرد حکمت عملی کے تحت جہاد کیا تھا، ۱۹۹۲ء میں یہ صدر کے منصب پر اور گلبدین حکمت یار وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہوئے، دوران جہاد گلبدین حکمت یار کی "حزب اسلامی" کو افغانستان کی سب سے منظم گوریلا فورس کی حیثیت حاصل رہی اور اس جماعت نے غاصب سوویت فوجوں کا جس پامردی واستقلال سے مقابلہ کیا وہ افغانستان کی تاریخ میں آب زر سے لکھا جائے گا۔

اس میں شبہہ نہیں کہ سوویت یونین کی شکست اور افغانستان میں اشتراکی سیاسی نظام کے خاتمے میں پاکستان اور امریکہ کی اعانت افغانی مجاہدین کو حاصل رہی اور امریکہ نے افغان مجاہدین کی تربیت اور اسلحہ کی فراہمی پر جتنی رقم صرف کی، اب اسے سود در سود کی شکل میں واپس لینا چاہتا تھا جب اس کی یہ توقع پوری نہیں ہوئی تو اس نے شمالی اتحاد کو ان کا حریف بنا کر کھڑا کردیا، جس کے بعد خانہ جنگی برپا ہوگئی جس پر قابو پانے کے لئے طالبان کی تحریک پورے زور وشور سے نمودار ہوئی۔

طالبان حکومت کا قیام واختتام روسی استبداد سے وسط ایشیا کے جن مسلم ملکوں کو آزادی ملی،

---

(۱) بحوالہ سوویت یونین کا زوال حوالہ مذکور "Islam and Resistance in Afghanistan", London

ان میں سے بالخصوص افغانستان میں نہایت قیمتی معدنیات گیس اور پٹرولیم کے ذخائر پائے جاتے ہیں، ان پر قابض ہونے کے لئے امریکی حکومت بے تاب تھی لیکن جب حکمت یار جیسے اسلامی رہنما کی موجودگی میں اس کے سیاسی عزائم کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو اس نے طالبان کی جس نے اس زمانہ میں خانہ جنگی کی شکار حکمراں جماعت کے خلاف ایک مسلح مہم چھیڑ رکھی تھی پشت پناہی کی اور حکمراں جماعت کو ٹھکانے لگانے کے لئے پاکستان کے وسیلہ سے طالبان کی مسلح مزاحمت میں بڑا تعاون کیا بالآخر ستمبر ۱۹۹۶ء میں افغانستان میں طالبان حکومت کا قیام عمل میں آیا لیکن طالبان خالص اسلامی حکومت کے قیام کے آرزومند اور مغرب کی اباحیت پسندانہ تہذیب وثقافت سے سخت بیزار تھے ان کی اس روش سے امریکہ کو بڑا جھٹکا لگا، طالبان فی الحقیقت افغانستان جیسے خانہ جنگی کے شکار ملک میں اسلامی تمدن اور امن وامان کی قندیل روشن کرنا چاہتے تھے، ان کا مقصد اس سرزمین کو ظلم وجور سے پاک کرکے عدل وانصاف کا بول بالا کرنا تھا افغانی عوام نے طالبان کے پاکیزہ جذبہ کی پوری قدر کی چند دنیا پرستوں اور مفاد پسندوں کو چھوڑ کر سب نے ان کی حمایت کی، ان کی حکومت کے قیام کے بعد ملک کے بڑے حصہ پر ان کا قبضہ ہوگیا، خانہ جنگی ختم ہوئی، قانون کا احترام کیا جانے لگا اور ملک کو امن وچین اور استحکام نصیب ہوا۔

طالبان کو مسند اقتدار پر پہنچانے میں امریکہ، پاکستان اور خود طالبان کی عوامی مقبولیت کے علاوہ ان مسلم عرب نوجوانوں کی قربانیوں کا بھی دخل تھا جو عالمی سطح پر مظلوموں کے ساتھ ہونے والی زیادتی اور اپنی اپنی حکومتوں کی داخلی پالیسی سے بیزار ہوکر افغان سوویت جنگ میں مجاہدین افغانستان کا ساتھ دے رہے تھے، انہوں نے طالبان کے مذہبی نقطہ نظر، ان طرز حکومت اور ان کی خارجہ پالیسی کو پسند کیا، وہ جس طرح کی تبدیلیوں کے خواہاں تھے، طالبان کی حکومت نے اس طرح کی تبدیلیاں کردی تھیں۔

لیکن ان کی خالص اسلامی طرز کی حکومت جرأت مندانہ اور آزادانہ پالیسی اقوام عالم کو بالکل نہ بھائی، اس لئے ان کے خلاف شدید قسم کی ریشہ دوانیاں شروع ہوگئیں، ان کے کسی قدر بے لچک رویے، شدت پسندی اور مصالح کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے بھی ان کے مخالفین کو ان کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کا موقع اور بہانہ مہیا کردیا، امریکہ چونکہ ان کو مسند اقتدار پر فائز کرنے میں شریک

تھا مگر جب وہ اس کے لئے مفید مطلب ثابت نہ ہوئے تو سب سے زیادہ وہی ان سے برہم ہوا اور انہیں نیست و نابود کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔

چنانچہ جب امریکہ کو بحر قزوین کے پاس موجود ذخائر تیل اور گیس کو خلیج فارس اور بحیرۂ عرب میں اپنے بحری جہازوں تک لانے کے لئے پائپ لائن بچھانے کے لئے افغانستان کی زمین کا استعمال کرنا ناگزیر ہوا تو اس نے طالبان حکمراں ملا عمر کے سامنے پروجیکٹ پیش کیا، انہوں نے افغانستان کی سرزمین دینے سے انکار کر دیا تو امریکہ کو بہت گراں گذرا، اس انکار کے بعد امریکی حکام طالبان حکومت کو مغربی تہذیب و مقصد کے لئے ایک بڑا چیلنج سمجھنے لگے اور اس ''نافرمانی'' کا مطلب یہ بھی سمجھا گیا کہ امریکہ کی کالونی بننے کے لئے افغانستان آمادہ نہیں ہے، چنانچہ ۱۹۹۹ء میں اس نے طالبان پر دباؤ ڈالنے کے لئے اقوام متحدہ کا سہارا لیا جب کہ اس کو کسی کارروائی کے لئے کسی سہارے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، اقوام متحدہ کی قرارداد ۱۲۶۷ اور دسمبر ۲۰۰۰ء میں قرارداد ۱۳۳۳ کے ذریعہ عملاً اعلان جنگ کر دیا، قرارداد ۱۳۳۳ کے تحت طالبان سے کہا گیا کہ وہ اپنے زیر کنٹرول علاقے میں دہشت گردی کی تنصیبات سے پاک کرنے کے لئے مؤثر اقدامات کریں اور طالبان مقدمہ میں ماخوذ افراد کو بین الاقوامی عدالت میں پیش کرنے کی کوششوں میں تعاون کریں اور اقوام متحدہ نے متعدد قراردادیں منظور کرائیں، بہت سی سختیاں اور پابندیاں عائد کیں مگر وہ بار آور نہیں ہوئیں

ابھی یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کو نیویارک اور واشنگٹن کا سانحہ پیش آیا، جس کو امریکہ نے اپنی قوم اور پوری انسانیت کے خلاف زبردست دہشت گردی اور جنگی کارروائی قرار دیا اور اسے اقدام جنگ سے تعبیر کر کے افغانستان میں موجود اسامہ بن لادن کے سر منڈھ دیا اور طالبان سے مطالبہ کیا کہ بلا تاخیر اسے امریکہ کے حوالہ کیا جائے، طالبان کی نڈر حکومت نے امریکہ سے اسامہ بن لادن اور ان کی تنظیم کے اس واقعہ میں ملوث ہونے کا واضح ثبوت مانگا، جس پر امریکہ نے کوئی توجہ نہیں دی بلکہ الٹے افغانستان کو دھمکی دی کہ اگر امریکی مطالبات پورے نہ کئے گئے تو اسے نہایت خطرناک انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔

افغانستان پر امریکی فوج کشی

بہرحال ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کے بم دھماکے نے دنیا کے سب سے زیادہ طاقت ور ملک کے سیاسی و تجارتی مراکز (ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پنٹاگن) کی ناقابل تسخیر دیواریں

پاش پاش کر دیں اور ۲۸ ملکوں سے تعلق رکھنے والے ۲۸۹۰ قیمتی افراد اس جانکاہ حادثہ کا شکار ہو گئے اور اب ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء تاریخ عالم کا ایک یادگار دن بن گیا، امریکہ نے اس واقعہ کو ''عالمی دہشت گردی'' کا نام دیا اور اسی کو بنیاد بنا کر افغانستان سے جنگ کا اعلان کر دیا، طاقت و اقتدار کے نشے میں سرشار ہو کر اس نے تحقیق و تفتیش کے بغیر ہی اس کی ساری ذمہ داری اسامہ بن لادن اور ان کی تنظیم القاعدہ پر ڈال دی اور ''القاعدہ اور طالبان'' کو دہشت گرد قرار دے کر اپنے اتحادی ممالک کے ساتھ مل کر ۷ر اکتوبر ۲۰۰۱ء کو افغانستان پر فوجی کارروائی شروع کر دی اور القاعدہ اور طالبان حکومت کی سرزنش کے نام پر خود ایک بڑی دہشت گردی کا مرتکب ہوا اور ہزاروں معصوم انسانوں کو ظلم و تشدد اور ایک نئے تصادم کی آگ میں جھونک دیا اور شدید بم باری کر کے افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجادی، اور شمالی اتحاد سے مل کر امریکہ نے طالبان کی پر امن اور اسلامی حکومت کو صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالا گو امریکہ کے خوف اور جبر کے سامنے عام طور پر لوگوں کو لب کشائی کی جرأت نہ ہوئی، تاہم اب آہستہ آہستہ بعض یورپین ممالک کے انصاف پسند لوگ افغانستان میں دہشت گردی کے نام پر ہونے والی اس کھلی فوجی کارروائی کو امریکہ کی کھلی ''دہشت گردی''، صریح ظلم اور اخلاقی اور سیاسی اعتبار سے ناقابل معافی جرم قرار دے رہے ہیں، ملاحظہ ہو:۔

''ایسی اقدار عالمی سطح پر تسلیم شدہ نہیں ہیں جو ہمارے ملک کے قتل عام (۱۱ر ستمبر کے دہشت گردانہ واقعات) کو (افغانستان میں) دوسرے قتل عام کا جواز مہیا کریں''۔(۱)

افغانستان کی تعمیر نو

امریکہ نے اسامہ اور ملا عمر کو پکڑنے کے لئے افغانستان پر حملہ کیا، اتنے بڑے پیمانے پر جنگی کارروائی کے باوجود اسامہ اور ملا عمر آج تک امریکہ کے ہاتھ نہیں لگ سکے، ان جنگی معرکوں میں طالبان اور القاعدہ کی ۱۰ر ہزار سے زائد ہلاکتوں کے علاوہ افغانستان کی سول آبادی میں بم باری کے ذریعہ جو ہلاکتیں ہوئیں ہمپشائر یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کے ڈیٹا بیس کے مطابق ۷ر اکتوبر ۲۰۰۱ء سے جون ۲۰۰۲ء تک ۳۶۲۰ معصوم لوگوں کی جانیں ضائع گئیں، (۲) حیرت ہے کہ افغانستان کی طالبان حکومت ظلم و بربریت کی آگ میں جلتی رہی اور عالم اسلام کے چھپن (۵۶) ملکوں کے سربراہوں نے اسے بے سہارا کر کے دشمنان اسلام کے حوالہ کر دیا اور کسی نے بھی امریکہ

---

(۱) دی نیشن، ۱۰ر اگست ۲۰۰۲ء (۲) بحوالہ ترجمان القرآن ستمبر ۲۰۰۲ء ص ۲۱

سے ۱۱ رستمبر کے اصل ذمہ داروں کو بے نقاب کرنے کی درخواست یا مطالبہ نہیں کیا۔

طالبان حکومت اور افغانستان کو ویران اور تباہ کرنے کے بعد ’’موجودہ تہذیب کے علم برداروں کو اس کی تعمیر نو کا خیال آیا، چنانچہ دسمبر ۲۰۰۱ء میں اقوام متحدہ کے زیر نگرانی جرمن کے شہر بون میں شمالی اتحاد، روم اور پشاور گروپ کے نمائندوں، افغان دانشوروں اور جنگجو کمانڈروں کے آٹھ دن کے مذاکرات کے بعد عبوری حکومت کی تشکیل ہوئی، چھ ماہ کے لئے عارضی حکومت بنی اس کا آغاز ۲۲ر دسمبر سے ہوا جس کے سربراہ حامد کرزئی مقرر کئے گئے اور طے پایا کہ چھ مہینے بعد افغان لویا جرگہ کا اجلاس منعقد ہوگا، جس میں آئندہ دو سال کے لئے نئی حکومت کی تشکیل عمل میں آئے گی، اقوام متحدہ کی نگرانی میں یہ بھی طے ہوا کہ طالبان حکومت کے خاتمہ کے بعد افغانستان کی سیاسی تعمیر نو کے لئے ایسا لائحہ عمل مرتب کیا جائے گا جس سے افغانستان کی خوشحالی اور پائدار ضمانت یقینی ہو، چنانچہ ۶ رماہ بعد جون ۲۰۰۲ء کے وسط میں لویا جرگہ کا اجلاس کابل میں طلب کیا گیا، اس میں ۱۰۵۱ منتخب افراد کے علاوہ ۴۷ رجنگجو کمانڈروں نے بھی شرکت کی جو بون معاہدہ کے خلاف تھی، نئی حکومت کی تشکیل میں حامد کرزئی حکومت کے پھر صدر مقرر کئے گئے، پنج شیری تاجک اتحاد کے عبداللہ کو وزارت خارجہ کا ذمہ دار، قاسم فہیم کو وزیر دفاع مقرر کیا گیا، تاج محمد کو وزیر داخلہ بنایا گیا تاہم سابق وزیر داخلہ یونس قانونی کو صدر کے مشیر برائے امور داخلہ کا عہدہ دیا گیا اور اس طرح حامد کرزئی کابینہ کی اہم وزارتوں میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی اور لویا جرگہ کو سامنے رکھ کر اصلاً امریکی ایجنڈے کو عملی جامہ پہنایا گیا۔

افغانستان کی موجودہ سیاست میں عورتوں کی نمائندگی کو خاص اہمیت دی جارہی ہے اور جدید عبوری حکومت میں ہزارہ قبیلہ کی شیعہ خاتون ’’سیماسر‘‘ کو نائب صدر اور امور خواتین کی وزارت کا اور دوسری سہیلہ صدیقی کو جو پیشے سے ڈاکٹر اور فکر میں سیکولر ہیں وزیر صحت کا عہدہ دیا گیا ہے، حکومت سازی کے اس طریقہ سے مغرب کے جمہوری نظام کا اندازہ ہوتا ہے جس میں مرد و زن کو آزادی حاصل ہو، طالبان امریکہ کے اختلاف کا اصل نکتہ یہی تھا۔

سفینۂ عشرت: فارسی شعرا کا ایک نادر تذکرہ

از ڈاکٹر محمد صادق حسین ☆

برصغیر ہند و پاک میں فارسی زبان میں تذکرہ نگاری کا آغاز مملوک سلاطین کے زمانے میں ہوا، گو یہ عہد فن تذکرہ نگاری میں کمیت کے لحاظ سے اتنا اہم نہیں ہے جتنا بعد کے ادوار ہیں تاہم دو اہم تذکرے یعنی ’’لباب الالباب‘‘ از محمد عوفی اور ’’تذکرۃ الشعرا‘‘ از دولت شاہ سمرقندی اسی زمانے میں لکھے گئے، جو بعد کے تذکرہ نگاروں کے لئے نمونے ثابت ہوئے، ’’لباب الالباب‘‘ ہندوستان میں لکھا گیا اور یہ تذکرہ نگاری کے فن کی اہم ترین کتابوں میں شمار ہوتا ہے، مغلیہ دور تذکرہ نگاری کے لئے زیادہ اہم اور ممتاز ہے، اسی دور کے اکثر تذکرہ نگار اسی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں، اس دور کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہندوؤں نے اس میں فارسی زبان و ادب کی طرف بڑا اعتنا کیا، جس کے نتیجے میں بہت سے ہندو ادبا اور شعرا منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے۔

مغلوں کے آخری دور میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ کا شیرازہ بکھرنے لگا تو اس وقت ہندو ملک کے انتظامی و مالی اہم عہدوں پر فائز تھے اس بنا پر اس زمانے میں فارسی زبان کے ہندو مصنفوں، شاعروں، ادیبوں اور انشا پردازوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جو دیگر علوم و فنون کی طرح تذکرہ نگاری کے میدان میں بھی اپنا جوہر دکھا رہے تھے، اس دور کے ہندو عالموں نے فارسی شعرا کے متعدد تذکرے لکھے، ان میں ’’ہمیشہ بہار‘‘ از کشن چند اخلاص (۱۱۳۶ھ)، ’’سفینۂ خوشگو‘‘ از بندرابن داس خوشگو (۱۱۳۷-۱۱۴۷ھ)، ’’سفینۂ عشرت‘‘ از درگا داس عشرت (۱۱۷۵ھ)، ’’گل رعنا‘‘ (۱۱۸۱-۱۱۸۲ھ) و ’’شام غریبان‘‘ (۱۱۸۲ھ) از لچھمی نرائن شفیق، ’’انیس الاحبا‘‘ از موہن لال انیس (۱۱۹۷ھ) اور ’’سفینۂ ہندی‘‘ از بھگوان داس ہندی (۱۲۱۹ھ) قابل ذکر ہیں۔

☆ ریسرچ اسکالر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی۔

''سفینۂ عشرت'' فارسی شعرا کا ایک اہم اور نادر تذکرہ ہے جس کا واحد قلمی نسخہ صرف خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے، یہ نسخہ ۲۶۲ اوراق پر مشتمل ہے، اس کا سائز ۱۱½ × ۷ : ۹ × ۵ اور ہر صفحہ میں ۱۷ سطریں ہیں، یہ نسخہ ناقص الاوسط ہے جس میں ۵۴۵ شعرا کا تذکرہ شامل ہے، اس کی ترتیب الفبائی ہے اور یہ نسخہ ''فریدون سابق'' پر تمام ہو جاتا ہے، گویا یہ اس کی پہلی جلد ہے، دوسری جلد کا ابھی تک سراغ نہیں مل سکا ہے، پہلی جلد کا بھی ایک ہی نسخہ متعارف ہے جو خدا بخش لائبریری کی ملکیت ہے، احمد گلچین معانی (۱)، ڈاکٹر علی رضا نقوی (۲) اور واستوری نے اس تذکرہ کا تعارف کراتے وقت خدا بخش نسخہ ہی کا حوالہ دیا ہے۔

''سفینۂ عشرت'' فارسی کے قدیم و جدید شعرا کا اہم تذکرہ ہے لیکن افسوس ہے کہ خود اس کے مصنف کے بارے میں عام تذکروں میں کسی طرح کے معلومات نہیں ملتے، راقم کو اس تذکرہ کے دیباچہ اور متن سے مصنف کے جو حالات فراہم ہوئے ہیں انہیں یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

تذکرہ نگار کا نام درگا داس اور تخلص عشرت تھا، ان کے والد کا نام مہتہ شیو شنکر ناگر، (۳) مصنف نے گو اپنی تاریخ پیدائش نہیں لکھی ہے تاہم تذکرہ کے نام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

''اگر سفینۂ عشرت'' نامیدہ شود بی نسبت نیست و تاریخ ہم اگر از نامش برآید خالی از مزنیست''۔(۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سفینۂ عشرت اس تذکرہ کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۱۷۵ھ برآمد ہوتا ہے اور جس وقت اس تذکرہ کی تالیف عمل میں آئی اس وقت مصنف کی صراحت کے مطابق ان کی عمر ۴۰ سال کی تھی، ان کی عبارت ملاحظہ ہو:۔

''از طلوع صبح شعور کہ تا حال کہ پای عمر بپایش مرحلۂ اربعین از مراحل حیاتست''۔(۵)

اس لحاظ سے ان کا سال پیدائش ۱۱۳۶ھ قرار پاتا ہے، یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستان کی باگ ڈور محمد شاہ کے ہاتھوں میں تھی، عشرت نے سلاطین مغلیہ کے پانچ بادشاہوں محمد شاہ (۱۱۳۴ھ-۱۱۶۱ھ)، احمد شاہ (۱۱۶۱ھ-۱۱۶۷ھ)، عالمگیر ثانی (۱۱۶۷-۱۱۷۲ھ)، شاہ جہاں ثانی (۱۱۷۳ھ)، اور شاہ عالم ثانی (۱۱۷۳-۱۲۰۲ھ) کا دور حکومت دیکھا تھا اور ان حکمرانوں کی سلطنت کے نشیب و فراز کے وہ عینی شاہد بھی ہیں، چونکہ عشرت کا سال وفات معلوم نہیں ہو سکا، اس لئے قطعی طور پر نہیں کہا

جا سکتا کہ ان پانچ بادشاہوں کے علاوہ کسی اور مغل حکمراں کا دور انہوں نے دیکھا تھا یا نہیں؟۔

عشرت نے اپنے زمانہ کے دستور کے مطابق تعلیم پائی اور اس وقت کے مشہور اساتذہ کرام سے کسب فیض کیا، ان میں سرفہرست سراج الدین خاں آرزو کا نام ملتا ہے، احمد گلچین معانی اس ضمن میں لکھتے ہیں:۔

''مؤلف کہ شرح حالش بدست نیامدہ ظاہرا از شاگردان سراج الدین علی خان آرزو بودہ زیرا کہ ترجمہ و منتخب اشعار او را از ہمہ مفصل تر آوردہ است''۔(۶)

یہ تو واقعہ ہے کہ انہوں نے سب سے مفصل حال سراج الدین علی خان آرزو کا لکھا ہے، چنانچہ ورق ۷۳ تا ۱۰۶ آرزو کے حالات اور اشعار پر محتوی ہے گویا مصنف نے ۳۴ اوراق میں ان کے حالات اور اشعار نقل کئے ہیں، لیکن اس میں انہوں نے اس کی کوئی صراحت نہیں کی ہے کہ انہوں نے آرزو سے استفادہ کیا ہے، جب کہ دوسرے شعرا کے بارے میں انہوں نے برملا اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے ان شعرا سے کسب فیض کیا ہے، مثلاً:۔

رائے پران ناتھ آرام: این عاصی کہ اکثر بہ جہت حصول استفادہ در خدمت آن بزرگوار حاضری شد و از بس تفصیلات کریمانہ بذل توجہ می فرمودند۔(۷)

لالہ سروپ سنگھ انس: فقیر راقم در خدمت ایشان بندگی است۔(۸)

لالہ سری گوپال تمیز: این ذرہ بی مقدار در عہد محمد شاہی از آنجناب استفادہ بعضی کتب ہندی نمود۔(۹)

مہتہ نرسنگھ داس خاکی: فقیر راقم در خدمت آن بزرگوار بندگی بود و بسیار توجہ می فرمود۔(۱۰)

عشرت کے معاصرین اور دوست واحباب میں رائے برنرائن آشنا، لالہ اجیت سنگھ، لالہ نربھے رام بیباک (از برادران و اخلاص مندان صمیمی این خاکسار بود)(۱۱) رائے گوپی ناتھ جمعت اور مرزا محمد محسن تاثیر (با این خاکسار صدیق دیرینہ بود)(۱۲) کے نام قابل ذکر ہیں۔

علمی و ادبی اعتبار سے عشرت کی تین حیثیتیں ہیں، شاعر، نثر نگار اور تذکرہ نویس، عشرت کے تخلص سے صاف ظاہر ہے کہ وہ طبع آزمائی کرتے تھے لیکن تلاش بسیار کے باوجود ان کے چند ہی اشعار دستیاب ہوئے ہیں جو خود انہوں نے ''سفینۂ عشرت'' کے دیباچہ میں درج کیا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

دی کارایش لوح و قلم کرد — کتاب نظم را عالم رقم کرد
بفرد مصر و کنعان خام آر است — که دران طالب یوسف زلیخا ست
چه معنی کان ورق پیچاپی ہامون — مکر ده صرف در لیلی و مجنون
چو محمود و ایازش یافت اتمام — بلند آواز تحسین گشت ایام
ززلف دلبران گفته قصیده — خرد زو شعر لازم سوی دیده
معمایی که از خال بتان ساخت — بلفظ و معنیش دل می توان باخت
درین فیروزه فرد اختراعی — بود از چار فصلش یک رباعی
مصرعه ہای شاخ سرود شمشاد — بہاریات او بر صفحهٔ باد
ازان معنی طراز ز ماتم و سور — درعالم نیست خبر یک نیست مشہور (۱۳)

رباعی ؎

این تازه رقم که تازه سازد جان را — ز بہار قسمت کلک مشک افشان را
باقی باد این بیاض بر صفحهٔ دہر — تا ہست لقا صحیفهٔ امکان را (۱۴)

نثر نگاری میں بھی عشرت کو یدطولی حاصل تھا، وہ مقفی و مسجع اور آسان وسہل دونوں قسم کی نثر نویسی پر یکساں قدرت رکھتے تھے، اب تک کی تحقیق کے مطابق ''سفینۂ عشرت'' ان کی واحد تصنیف ہے، خود اس تذکرہ میں انہوں نے دوطرح کی نثر کا نمونہ پیش کیا ہے، اس کتاب کا دیباچہ نثر مسجع و مقفع میں لکھا ہے، نمونہ پیش ہے:۔

''چہار وضہ رضوانش نخوانم، کہ ہرطرف حور وغلمان افکار معالی فوج درفوج، و در خیابان بین السطورش ماء معین معنی موج در موج، و دائر حرفش گرد نامہ ایست برای حاضر کردن پریزادان، نقاطش نقش مربعیست جہت تسخیر دیوان''۔(۱۵)

البتہ انہوں نے متن میں آسان اور سادہ نثر کا استعمال کیا ہے، مثلاً:۔

''درعہد سلطان محمد غزنوی استاد سخنوران خراسان بودہ، گویند چون اورا بہ نظم شاہنامہ تکلیف کردند بضعف پیری رابہانہ ساختہ''۔(۱۶)

درگاداس عشرت کی علمی وادبی خدمات کا تنہا شاہد ان کا تذکرہ ''سفینۂ عشرت'' ہے، اس

کے علاوہ کسی اور تصنیف کا اب تک سراغ نہیں مل سکا ہے، یہ ضرور ہے کہ وہ شاعری کرتے تھے اور جملہ اصناف سخن پر ان کو قدرت بھی تھی، اس لئے یہ تسلیم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ان کا دیوان بھی ضرور رہا ہوگا، جو حوادث روزگار کی نذر ہوگیا، سوائے ''سفینۂ عشرت'' کے دیباچہ میں ان کے چند اشعار کے اور کلام فی الحال دستیاب نہیں ہے، لیکن سفینۂ عشرت کی شکل میں جو تذکرہ انہوں نے فارسی کے قدیم وجدید شعرا کا مرتب کیا ہے وہ ان کی علمی وادبی شناخت کے لئے کافی ہے۔

''سفینۂ عشرت'' فارسی کا تیسرا تذکرہ ہے جو کسی ہندو عالم کے ہاتھوں تکمیل پایا، اس سے قبل دو تذکرے ''ہمیشہ بہار'' از کشن چند اخلاص اور ''سفینۂ خوشگو'' از بندرابن داس خوشگو ہی ایسے نظر آتے ہیں جو کسی ہندو مصنف کی تصنیف ہیں، لیکن ان دونوں کے مقابلے میں ''سفینۂ عشرت'' کی اہمیت بایں طور ہے کہ اس میں شعرا کے کلام کا مکمل انتخاب کیا گیا ہے اور بعض شعرا کے حالات بھی تفصیل سے قلم بند کئے گئے ہیں مثلاً، ملا محمد اشرف (ق ۵_۲۴=۲۰اوراق)، شفیعائی اثر (۲۴_۳۳=۱۰اوراق)، اہلی شیرازی (۳۶_۴۴=۹اوراق)، انوری (۶۳_۶۸=۶اوراق)، خان آرزو (۷۳_۱۰۶=۳۴اوراق)، لالہ نرنجھے بیباک (۱۱۵_۱۲۳=۹اوراق)، بیدل (۱۲۵_۱۳۹=۱۵اوراق)، داراب بیگ جویا (۱۶۸_۱۷۲=۶اوراق)، حافظ شیرازی (۱۷۵_۱۸۰=۵اوراق)، حزین (۱۸۶_۲۰۱=۱۶اوراق) وغیرہ۔

جہاں اس تذکرہ سے شعرا کے حالات اور علمی وادبی خدمات کا بخوبی پتا لگایا جاسکتا ہے وہاں اس دور کے سیاسی ومعاشرتی نشیب وفراز کی بھی بخوبی واقفیت حاصل کی جاسکتی ہے، کیونکہ جابجا شعرا کے احوال کے ذیل میں ان کے زمانے کے بعض تاریخی واقعات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے، خاص طور پر معاصر شعرا کے بارے میں لکھتے وقت ان کے زمانے کے بعض اہم تاریخی وقائع بھی مجملاً بیان کئے گئے ہیں، اس کی ایک اور امتیازی خصوصیت ہندو شعرا کا ذکر ہے، جن ہندو شعرا کا ذکر اس میں کیا گیا ہے ان میں سے اکثر کا ذکر بعد کے تذکروں میں نہیں آیا ہے، عشرت نے ۱۹ ہندو شعرا کا تذکرہ شامل کتاب کیا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے:۔

۱۔ رای ہرنراین آشنا، ۲۔ رای پران ناتھ آرام، ۳۔ لالہ اجیت سنگھ، ۴۔ لالہ سروپ سنگھ انس، ۵۔ رای چندر بھان برہمن، ۶۔ سرداران بیگ برہمن، ۷۔ لالہ نربھی رام بیباک، ۸۔ سدانند بے تکلف، ۹۔ بھوپت رای بیراگی بیغم، ۱۰۔ لالہ سرن گوپال تمیز، ۱۱۔ رای گوپی ناتھ جمعیت، ۱۲۔ لالہ شیورام

داس حیا، ۱۳۔ مہنہ نرسنگھ داس خاکی، ۱۴۔ لالہ بندرابن خوشگو، ۱۵۔ دیابت رای کھتری، ۱۶۔ لالہ سروپ سنگھ دیوانہ، ۱۷۔ رای منوہر، ۱۸۔ لالہ دیبی سہای رفیق، ۱۹۔ لالہ سکھ راج سبقت۔

ان میں سے اکثر شعرا عشرت کے معاصر ہیں، ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنی کتاب ''ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ'' میں ان میں سے صرف ۸ شعرا کا تذکرہ شامل کیا ہے۔

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ ''سفینۂ عشرت'' کی صرف ایک ہی جلد دستیاب ہے اور اس کا بھی ایک ہی نسخہ خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس میں الف سے س تک کے شعرا کے احوال و اشعار مندرج ہیں جس میں ۵۴۲ شعرا شامل ہیں، جن کے ناموں کی ایک فہرست درج کی جاتی ہے:۔

۱۔ اسدی طوسی (م ۴۰۹ھ)
۲۔ ابوالفرج (م ۴۸۰ھ)
۳۔ ارزقی (م ۵۸۰ھ)
۴۔ ابوالعلا گنجوی (م ۵۷۰ھ)
۵۔ ادیب صابر (م ۵۴۶ھ)
۶۔ ملا اوجی
۷۔ ملا آگاہ
۸۔ ملا محمد سعید اشرف (م ۱۱۱۳ھ)
۹۔ شفیعای اثر
۱۰۔ شیخ اوحدی مراغی (م ۶۹۷ھ)
۱۱۔ رای بہرزان آشنا (قبل ۱۱۷۵ھ) (۱۷)
۱۲۔ اوجی (۱۸)
۱۳۔ انسی (۱۹)
۱۴۔ ابوسعید ابوالخیر (م ۴۴۰ھ)
۱۵۔ شیخ ابوالفضل مبارک (۲۰)
۱۶۔ آصفی (۲۱)

۱۷۔ اہلی خراسانی
۱۸۔ مولانا اہلی خراسانی (م ۹۴۲ھ) (۲۲)
۱۹۔ آہی
۲۰۔ مولانا آگہی
۲۱۔ مولانا احمد شیرازی
۲۲۔ شیخ آذری (م ۹۲۶ھ) (۲۳)
۲۳۔ امین الدین
۲۴۔ اثیر الدین اومانی (م ۶۶۵ھ)
۲۵۔ الفتی
۲۶۔ اشراق، میر باقر داماد (م ۱۱۴۰ھ) (۲۴)
۲۷۔ اسیر لاہوری
۲۸۔ اثیر الدین اخسیکتی
۲۹۔ قاضی ابوالبرکات سمرقندی
۳۰۔ مرزا ابراہیم قانونی
۳۱۔ خواجہ ارجاسپ امیدی (عہد شاہ اسمٰعیل صفوی)
۳۲۔ ابراہیم بیگ قزلباش (۲۵)

۳۳۔ ابراہیم حسین نخشبی (عہد جہاں گیر)
۳۴۔ میر ابوالہادی (۲۶)
۳۵۔ میر ابوالہادی (۲۷)
۳۶۔ سلطان احمد (عہد صفوی)
۳۷۔ اسعد اللہ (عہد شاہ طہماسپ)
۳۸۔ اسعد بیگ قزوینی (عہد اکبر) (۲۸)
۳۹۔ حاجی اسمٰعیل قزوینی (عہد شاہ طہماسپ صفوی)
۴۰۔ اشرف خان
۴۱۔ اطہری (ہم عصر شیدا)
۴۲۔ خواجہ افضل الدین افضل (عہد شاہ اسمٰعیل ثانی)
۴۳۔ آفتی خشی (عہد شاہ طہماسپ صفوی)
۴۴۔ آگہی یزدی
۴۵۔ میر الٰہی ہمدانی (۲۹)
۴۶۔ حکیم مسیح الزماں (۳۰)
۴۷۔ امین الدین (عہد شاہ طہماسپ صفوی)
۴۸۔ نور محمد انور جونپوری (معاصر شیدا)
۴۹۔ ایمانی یزدی
۵۰۔ ملا داؤد الفت شوستری
۵۱۔ مرزا شریف ایہام اصفہانی (۳۱)
۵۲۔ ملا بقای انوار بخارائی (۳۲)
۵۳۔ مولانا رفیع الدین ابہری
۵۴۔ مولانا اسمٰعیل نخشبی
۵۵۔ ایمانی ولد محمود

۵۶۔ قاضی امین
۵۷۔ میر آجری یزدی
۵۸۔ ملا آثار (۳۳)
۵۹۔ میر محمد مومن ادائی
۶۰۔ امیر کمال الدین امیری
۶۱۔ ابوسعید مشہور بہ میرزائی (۳۴)
۶۲۔ شیخ ابونصر فراہی (عہد بہرام شاہ)
۶۳۔ شیخ محمد صالح معروف بہ محمد کاظم آگاہ (۳۵)
۶۴۔ مرزا اسمٰعیل ایما (م ۱۰۸۴ھ)
۶۵۔ ملا محمد زمان اثر
۶۶۔ ملا نظام اعجاز ہروی (۳۶)
۶۷۔ میر امانی (م ۹۸۱ھ) (۳۷)
۶۸۔ ایچی ہروی
۶۹۔ الفتی مشہدی (عہد اکبر)
۷۰۔ سید امیر خاں (عہد بہادر شاہ)
۷۱۔ احمد قلی خان ایمن (عہد محمد شاہی)
۷۲۔ حکیم ابوالفتح
۷۳۔ میرزا ابوتراب بیگ رنجدانی (عہد شاہ عباس ماضی)
۷۴۔ ملا اعلیٰ علی قلی بیگ (عہد صاحبقران ثانی)
۷۵۔ ابوالقاسم مرزا (عہد صفوی)
۷۶۔ محمد ابراہیم انصاف (۳۸)
۷۷۔ امام الدین اکبر (۳۹)
۷۸۔ ممتاز بیگ اسیری (عہد سلیمان شاہ صفوی)

۷۹۔ مرزا امین نصر آبادی (۴۰)
۸۰۔ شاہ ولی اللہ اشتیاق (م بعد ۱۱۴۰ھ) (۴۱)
۸۱۔ کمال الدین الجرتی (عہد سلطان طغرل سلجوق)
۸۲۔ مرزا محمد اکبر (عہد شاہ عباس ماضی)
۸۳۔ مرزا اصغر طوسی (شاگرد جامی)
۸۴۔ ابوالفیض
۸۵۔ اسد یار خان انسان (عہد محمد شاہ)
۸۶۔ امیر خان انجام (۴۲)
۸۷۔ خواجہ محمد افضل شاعر
۸۸۔ مرزا صدرالدین محمد آرام (عہد شاہ عباس ثانی)
۸۹۔ شیخ امام احمد غزالی (۴۳)
۹۰۔ مرزا اسمٰعیل بیگ شاملوانسی
۹۱۔ مولانا حیدر علی احدی و اظہر (عہد اکبر)
۹۲۔ ملا آنی (عہد اکبر)
۹۳۔ میر افسر
۹۴۔ محمد علی بیگ افسر (۴۴)
۹۵۔ شیخ سعد اللہ احقر (م ۱۱۵۴ھ)
۹۶۔ میاں محمد صادق القا (۴۵)
۹۷۔ امیر قاضی امیری (م ۹۸۴ھ)
۹۸۔ میر منور خاں امکان (عہد محمد شاہی)
۹۹۔ احسن اللہ خاں احسن (عہد محمد شاہی)
۱۰۰۔ رای پران ناتھ آرام
۱۰۱۔ لالہ اجیت سنگھ (۴۶)

۱۰۲۔ لالہ سروپ سنگھ انس (۴۷)
۱۰۳۔ ایزد بخش ایزد (۴۸)
۱۰۴۔ میر ابوالحسن اماقی (معاصر دقیقی)
۱۰۵۔ ابوالفتح (عہد نوح سامانی)
۱۰۶۔ قزلباش خاں امید (م قبل ۱۱۷۵ھ) (۴۹)
۱۰۷۔ امان اللہ خاں امانی (م اوایل عہد عالمگیری)
۱۰۸۔ ابوالعلی بیگ انیسی (عہد اکبر شاہ)
۱۰۹۔ تقی اوحدی
۱۱۰۔ مرزا جلال شہرستانی اسیر (م ۱۰۶۹ھ)
۱۱۱۔ نواب ظفر خاں احسن (م ۱۰۷۳ھ)
۱۱۲۔ نواب عنایت خاں آشنا (م ۱۰۷۷ھ)
۱۱۳۔ میر عبدالرسول استغنا کشمیری (عہد عالمگیری)
۱۱۴۔ آفریں لاہوری (م ۱۱۵۰ھ)
۱۱۵۔ انوری (م ۵۷۲ھ) (۵۰)
۱۱۶۔ نواب اسحاق خاں (عہد شاہ بدایونی)
۱۱۷۔ مولوی محمد سعید اشرف اعجاز (م ۱۱۰۷ھ)
۱۱۸۔ میر محمد احسن ایجاد (م ۱۱۳۲ھ)
۱۱۹۔ ابوالفیاض قطب الدین محمد اعظم (۱۰۵۶ھ۔۱۱۱۸ھ) (۵۱)
۱۲۰۔ حسین آشوب مازندرانی (۵۲)
۱۲۱۔ میر آشوب ہمدانی
۱۲۲۔ مقیمائی احسان
۱۲۳۔ اختری (۵۳)
۱۲۴۔ میر سید لطف اللہ احمدی (۱۰۵۳۔۱۱۴۳ھ) (۵۴)

۱۲۵۔ سید حسن آیما بلگرامی (م ۱۱۹۰ھ)
۱۲۶۔ شیخ کمال الدین افسری دہلوی (عہد عالمگیر)
۱۲۷۔ بابا اصلی
۱۲۸۔ عبداللہ امانی (۵۵)
۱۲۹۔ میر شاہ ایمان
۱۳۰۔ آصف قمی (عہد شاہ جہانی) (۵۶)
۱۳۱۔ مرزا عبداللہ الفت خراسانی (۵۷)
۱۳۲۔ میر محمد حنیف الفت الہ آبادی (م ۱۱۳۰ھ) (۵۸)
۱۳۳۔ الفتی (عہد عبداللہ قطب شاہی) (۵۹)
۱۳۴۔ ملک ابوالفتح (۶۰)
۱۳۵۔ مرزا اسحاق (م ۱۰۷۹ھ)
۱۳۶۔ مرزا ابراہیم (۶۱)
۱۳۷۔ اعوی سیستانی (۶۲)
۱۳۸۔ مرزا ابراہیم ادھم (م ۱۰۶۰ھ) (۶۳)
۱۳۹۔ میرزا ابدال اصفہانی (۶۴)
۱۴۰۔ امیر شاہی سبزواری
۱۴۱۔ الف (عہد شاہ اسمٰعیل)
۱۴۲۔ امیری خراسانی
۱۴۳۔ امینی خراسانی
۱۴۴۔ جلال الدین محمد اکبر شاہ (م ۱۰۱۴ھ)
۱۴۵۔ احمد سلطان اعظم (۶۵)
۱۴۶۔ اقدسی (م ۱۰۰۳ھ) (۶۶)
۱۴۷۔ رای برزاین آشنا (قبل ۱۱۷۵ھ) (۶۷)

۱۴۸۔ سراج الدین علی خاں آرزو (متولد ۱۰۹۹ھ) (۶۸)
۱۴۹۔ بدر شاشی (م ۷۵۵ھ)
۱۵۰۔ سیف الدین بدیعی
۱۵۱۔ بیاخص ہندی
۱۵۲۔ برہان اللہ بن عبدالعزیز (۶۹)
۱۵۳۔ باقیای بانی (۷۰)
۱۵۴۔ آق صانع برہان
۱۵۵۔ مرزا جان بہائی
۱۵۶۔ مرزا بدیع (معاصر طاہر نصر آبادی)
۱۵۷۔ حولا بہائی (۷۱)
۱۵۸۔ آقا عبدالباقی باقی نہاوندی (معاصر عبدالرحیم خان خاناں)
۱۵۹۔ بزمی ہمدانی (۷۲)
۱۶۰۔ مولانا بدخشی
۱۶۱۔ بیکسی ششتری
۱۶۲۔ میر شرف الدین علی پیام اکبرآبادی (م بعد ۱۱۰۰ھ) (۷۳)
۱۶۳۔ بقائی جونپوری
۱۶۴۔ مولانا بقائی خراسانی (م ۱۰۱۱ھ) (۷۴)
۱۶۵۔ میر برہان
۱۶۶۔ محمد بقا بقائی سہارنپوری (عہد عالمگیری)
۱۶۷۔ مرزا محمد بسمل
۱۶۸۔ حاجی بیتا (عہد شاہ جہانی)

۱۶۹۔ ملا جامی بجو دسبزواری (عہد شاہ جہانی)
۱۷۰۔ بہزاد بیگ بیاتی
۱۷۱۔ مولانا بنائی (م ۹۱۸ھ)
۱۷۲۔ میر محمد باقر یزدی (۷۵)
۱۷۳۔ مولانا باقر دماوندی (۷۶)
۱۷۴۔ پیروستان
۱۷۵۔ پیروی ساوی
۱۷۶۔ بینش کشمیری (معاصر عنایت خاں آشنا)
۱۷۷۔ ابوالحسن بیگانہ (شاگرد صایب)
۱۷۸۔ ظہیر الدین بابر بادشاہ
۱۷۹۔ بدیعی سمرقندی (عہد سلطان حسین بایقرا)
۱۸۰۔ حکیم پرتوی شیرازی (عہد ابراہیم مرزا ابن شاہ رخ)
۱۸۱۔ بساطی سمرقندی
۱۸۲۔ بقائی کماگر
۱۸۳۔ بقائی خوارزمی
۱۸۴۔ بلالی
۱۸۵۔ مولانا کمال الدین بنائی
۱۸۶۔ بیرام خان خاناں
۱۸۷۔ مولانا بابا شاہ
۱۸۸۔ حاجی بہرام بخاری
۱۸۹۔ میر محمد باقر (اواخر عہد شاہ عباس ثانی)
۱۹۰۔ میرزا باقر
۱۹۱۔ محمد باقر
۱۹۲۔ میرزا باقر بیگ
۱۹۳۔ حاجی باقر (عہد شاہ عباس)
۱۹۴۔ محمد باقر جردہ (معاصر ظہوری)
۱۹۵۔ رای چندر بھان برہمن (م ۱۰۷۷ھ)
۱۹۶۔ سردان بیگ برہمن
۱۹۷۔ لالہ نربھی رام بیباک (م ۱۱۶۷ھ)
۱۹۸۔ حاجی محمد تقی بسمل
۱۹۹۔ میرزا احمدی بیگ بیرنگ (م ۱۱۲۳ھ) (۷۷)
۲۰۰۔ رفیع خاں باذل (عہد بہادر شاہ)
۲۰۱۔ مخلص خاں بیدا (عہد بہادر شاہ)
۲۰۲۔ سدا نند بی تکلف (م ۱۱۲۹ھ)
۲۰۳۔ بھوبت رای بیراگی بیغم (م ۱۱۳۲ھ)
۲۰۴۔ میر عظمت اللہ بیخبر (م ۱۱۴۲ھ)
۲۰۵۔ بسحاق اطعمہ (م ۸۳۰ھ)
۲۰۶۔ بہادر خاں بے اختیار (۷۸)
۲۰۷۔ بیکسی غزنوی (م ۹۷۳ھ)
۲۰۸۔ فاخر پنہا
۲۰۹۔ پیامی، شیخ عبدالسلام
۲۱۰۔ پیامی استر آبادی
۲۱۱۔ بہاء الدین محمد
۲۱۲۔ میرزا عبدالقادر بیدل (۱۰۵۴۔۱۱۳۳ھ) (۷۹)
۲۱۳۔ مرزا محمد محسن تاثیر (۸۰)
۲۱۴۔ عبداللطیف خاں تنہا (عہد عالم گیری)

۲۱۵۔ حکیم کوچک تنہا (عہد شاہ عباس ثانی)
۲۱۶۔ محمد ہاشم تسلیم (عہد عالمگیری) (۸۱)
۲۱۷۔ میرزا ابوالحسن تسلی و تمنا
۲۱۸۔ علی رضای تجلی (۱۰۸۷ھ باحیات) (۸۲)
۲۱۹۔ تجلی کاشی (م ۱۰۱۹ھ) (۸۳)
۲۲۰۔ حافظ تجلی امی
۲۲۱۔ حافظ محمد جمال تلاش (م ۱۱۲۷ھ)
۲۲۲۔ میرزا محمد تمکین (م ۱۱۳۲ھ) (۸۴)
۲۲۳۔ میرزا باقر تابع
۲۲۴۔ کمال الدین تشبیہی کاشی
۲۲۵۔ تقی سبزواری
۲۲۶۔ میر محمد تقی کاشی
۲۲۷۔ محمد تقی نیشاپوری (اواخر عہد محمد شاہ)
۲۲۸۔ محمد تقی ہمدانی (م ۱۰۲۱ھ)
۲۲۹۔ لالہ سری گوپال تمیز (قبل ۱۱۷۵ھ) (۸۶)
۲۳۰۔ میر محمد طاہر تسلیم
۲۳۱۔ رحمت اللہ تمکین (شاگرد عبدالغنی قبول)
۲۳۲۔ فتح علی تسکین (اوایل عہد عالمگیری) (۸۷)
۲۳۳۔ عبدالعظیم تحسین (شاگرد فقیر اللہ آفرین)
۲۳۴۔ عبدالعلی تحسین کشمیری
۲۳۵۔ میر عسکری تحسین (م ۱۱۷۳ھ)
۲۳۶۔ خواجہ حسین ثنائی (م ۹۹۶ھ) (۸۸)
۲۳۷۔ شاہ عباس ثانی (م ۱۰۷۶ھ)
۲۳۸۔ میر مفاخر حسین ثاقب
۲۳۹۔ میر محمد افضل ثابت (م ۱۱۵۲ھ) (۸۹)
۲۴۰۔ ثابت کاشی
۲۴۱۔ ملا ثاقب بخاری
۲۴۲۔ ثانی خاں ہروی (عہد اکبر)
۲۴۳۔ محمد جان بیگ (معاصر طاہر نصر آبادی)
۲۴۴۔ مرزا جعفر قزوینی
۲۴۵۔ میر محمد جعفر جواب (عہد محمد شاہی)
۲۴۶۔ میر سید علی جولاں (عہد محمد شاہی)
۲۴۷۔ محمد مقیم جعفری (م ۱۰۷۹ھ)
۲۴۸۔ خواجہ مقصود جامع کشمیری (شاگرد عبدالغنی قبول)
۲۴۹۔ جمال اللہ قزوینی (عہد آقا خان)
۲۵۰۔ جمال الدین گیلانی
۲۵۱۔ مولانا جمال الدین عتیقی (۹۰)
۲۵۲۔ میرزا جعفر (عہد نجف قلی خاں)
۲۵۳۔ جمال (۹۱)
۲۵۴۔ میر سید علی جدای
۲۵۵۔ جوہری سمرقندی
۲۵۶۔ رای گوپی ناتھ جمعیت (۹۲)
۲۵۷۔ جمال الدین محمد جمال (معاصر خاقانی)
۲۵۸۔ میر عبدالکریم جسیم (عہد جہانگیری)
۲۵۹۔ ملا جمالی دہلوی (م ۹۲۵ھ) (۹۳)
۲۶۰۔ مولوی عبدالرحمن جامی (۸۱۷۔۸۹۹ھ) (۹۴)

۲۶۱۔ ارجمند جنونؔ

۲۶۲۔ جوہریؔ زرگر (شاگرد ادیب صابر)

۲۶۳۔ مرزا جعفر (عہد اکبر)

۲۶۴۔ جاروبیؔ

۲۶۵۔ مولانا محمد جاتیؔ

۲۶۶۔ سید جلال الدین

۲۶۷۔ خواجہ جلالؔ

۲۶۸۔ ملا جلالیؔ (عہد شاہ طہماسپ صفوی)

۲۶۹۔ جلال الدین محمود

۲۷۰۔ میر جمال عراقی

۲۷۱۔ جاہیؔ (عہد شاہ اسمٰعیل ثانی)

۲۷۲۔ درویش جاوید (معاصر اوحدی)

۲۷۳۔ چاکری سبزواری

۲۷۴۔ چاکر علی خاں

۲۷۵۔ میر جانی

۲۷۶۔ مرزا جان بیگ (عہد شاہ طہماسپ)

۲۷۷۔ مولانا جدائی

۲۷۸۔ جسمی ہمدانی (۹۵)

۲۷۹۔ جلال الدین حسین نیشاپوری (۹۶)

۲۸۰۔ ملا علی جاوید

۲۸۱۔ شیخ جنتی اصفہانی

۲۸۲۔ محمد ایوب جودت (عہد فرخ سیر) (۹۷)

۲۸۳۔ میر جلال الدین جعفر فراہانی (۹۸)

۲۸۴۔ جہانگیر بادشاہ

۲۸۵۔ داراب بیگ جویاؔ کشمیری

۲۸۶۔ شیخ معین جامعی (۹۹)

۲۸۷۔ میر جیبی (۱۰۰)

۲۸۸۔ مولانا جلال الدین رومی (م ۶۶۱ھ)

۲۸۹۔ جنونی

۲۹۰۔ حافظ شیرازی (م ۷۹۱ھ)

۲۹۱۔ حکیم ناصر خسرو حجتؔ

۲۹۲۔ اشرف الدین حسین بن ناصر علوی (م ۵۷۵ھ)

۲۹۳۔ حافظ حلوائی (عہد شاہ رخ مرزا)

۲۹۴۔ مولانا حاجی سمرقندی

۲۹۵۔ حاجی طباخ

۲۹۶۔ میر حزنی

۲۹۷۔ میر حسن دہلوی

۲۹۸۔ سلطان حسین مرزا

۲۹۹۔ قاسم بیگ حالتی (عہد شاہ طہماسپ صفوی)

۳۰۰۔ حامدی قمی (عہد شاہ طہماسپ صفوی)

۳۰۱۔ مولانا حاتم کاشی (۱۰۱)

۳۰۲۔ مولانا حاجی طہرانی (۱۰۲)

۳۰۳۔ مولانا حرفی (عہد شاہ طہماسپ صفوی)

۳۰۴۔ مولانا حزنی اصفہانی (۱۰۳)

۳۰۵۔ میر حضوری قمی (معاصر تقی اوحدی)

۳۰۶۔ حقی خراسانی مدنی (۱۰۴)

۳۰۷۔ شیخ حقی خواندساری

۳۰۸۔ حفیری تبریزی (۱۰۵)

۳۰۹۔ حفیری ہروی (۱۰۶)

۳۱۰۔ مولانا حیرتی ماوراءالنہری (عہد شاہ طہماسپ صفوی)

۳۱۱۔ ملا گنجی حربادوقانی (شاگرد مرزا امیر)

۳۱۲۔ ملا میر علی بیگ حشمتی خوانساری

۳۱۳۔ میر حشمتی (۱۰۷)

۳۱۴۔ میرزا حسین علی اصفہانی (عہد شاہ عباس ماضی)

۳۱۵۔ ملا حیران اصفہانی

۳۱۶۔ شیخ محمود حیرانؔ سرہندی

۳۱۷۔ حفظ اللہ خاں حفظی (م ۱۱۱۲ھ)

۳۱۸۔ شیخ حسام الدین (عہد عالمگیر)

۳۱۹۔ مرزا حاتم بیگ حاتمؔ (عہد فرخ سیر)

۳۲۰۔ لالہ شیورام داس حیاؔ (م ۱۱۴۴ھ)

۳۲۱۔ یادگار بیگ حالتی

۳۲۲۔ ملا حسین علی

۳۲۳۔ قاضی حسین خوانساری

۳۲۴۔ ملا محمد حسین (۱۰۸)

۳۲۵۔ ملا حبیب اللہ

۳۲۶۔ شیخ حسین قریشی (۱۰۹)

۳۲۷۔ ملا حبیب

۳۲۸۔ حسن بیگ

۳۲۹۔ حاجی محمود حفظی (۱۱۰)

۳۳۰۔ آقا حسن

۳۳۱۔ حکیم بیگ خاں حاکمؔ

۳۳۲۔ حسین صراف

۳۳۳۔ میر رضا علی حقیقت

۳۳۴۔ مرزا حسن خاں (معاصر طاہر نصر آبادی)

۳۳۵۔ حاجی محمد حاجی

۳۳۶۔ حسن بیگ ایشی قندحاری

۳۳۷۔ محتشم علی خاں حشمت (عہد محمد شاہی)

۳۳۸۔ مرزا اسمٰعیل حجاب (عہد عالمگیر)

۳۳۹۔ محمد علی حشمت (شاگرد قبول)

۳۴۰۔ آقا حقی خوانساری

۳۴۱۔ حاجی حیدری تبریزی (۱۱۱)

۳۴۲۔ درویش حیدر یزدی

۳۴۳۔ حاتم بیگ

۳۴۴۔ حکیم حاذق

۳۴۵۔ مولانا حسامی (۱۱۲)

۳۴۶۔ بابا حسامی

۳۴۷۔ دیوانہ حسامی قلندری

۳۴۸۔ شیخ محمد حزیں

۳۴۹۔ امیر خسرو دہلوی

۳۵۰۔ خاقانی (م ۵۸۸ھ) (۱۱۳)

۳۵۱۔ حکیم عمر خیام (م ۵۱۷ھ)

۳۵۲۔ ملا خاوری

۳۵۳۔ خواجوی کرمانی (م ۷۴۲ھ)
۳۵۴۔ خیالی بخاری
۳۵۵۔ خیالی ہروی
۳۵۶۔ خیالی خجندی
۳۵۷۔ خان اعظم کوکہ
۳۵۸۔ خان عالم
۳۵۹۔ خادمی خراسانی (م ۱۰۰۰ھ)
۳۶۰۔ خاطری کاشانی (۱۱۴)
۳۶۱۔ بابا خردی
۳۶۲۔ بابا خسروری (۱۱۵)
۳۶۳۔ خضری (م ۹۹۸ھ)
۳۶۴۔ خضری قزوینی
۳۶۵۔ خواری تبریزی (عہد شاہ طہماسپ)
۳۶۶۔ خلقی شوشتری (معاصر تقی اوحدی)
۳۶۷۔ مرزا خلیل خلقی
۳۶۸۔ باقرای خلیل کاشانی
۳۶۹۔ نظر علی خاں خادم (۱۱۶)
۳۷۰۔ خواجہ کلاں (۱۱۷)
۳۷۱۔ خواجہ کلاں کرمانی (شاگرد جلال اسیر)
۳۷۲۔ سید عبداللہ خالی
۳۷۳۔ خواجہ خواجگی
۳۷۴۔ خاشع (شاگرد ملا ساطع)
۳۷۵۔ ملا خیالی لاہجی (۱۱۸)
۳۷۶۔ ملا شریف خازن
۳۷۷۔ میر محمد غیاث الدین خلقی (عہد شاہ اسمٰعیل صفوی)
۳۷۸۔ حافظ محمد خیالی
۳۷۹۔ محمد امین خازن
۳۸۰۔ مرزا خصمی (۱۱۹)
۳۸۱۔ ملا خواجہ علی مشہدی (۱۲۰)
۳۸۲۔ مولانا خاتمی
۳۸۳۔ شکر اللہ خاں خاکسار (م ۱۱۱۲ھ)
۳۸۴۔ حسن بیگ خروشی (۱۲۱)
۳۸۵۔ مہتہ نرسنگھ داس خاکی (استاد عشرت)
۳۸۶۔ امیر خرد
۳۸۷۔ امتیاز خاں خالص (م ۱۱۲۲ھ) (۱۲۲)
۳۸۸۔ فضل اللہ ہنرور خوشتر (م ۱۱۴۱ھ)
۳۸۹۔ لالہ بندرابن خوشگو (۱۲۳)
۳۹۰۔ میر رضی دانش (عہد شاہ جہاں)
۳۹۱۔ درویش دہکی
۳۹۲۔ درویش روغنگر
۳۹۳۔ امیر دوست شاہ
۳۹۴۔ داعی رنجدانی (معاصر تقی اوحدی)
۳۹۵۔ داعی ہمدانی (معاصر تقی اوحدی)
۳۹۶۔ داعی (۱۲۴)
۳۹۷۔ دخلی صفاہانی (عہد شاہ طہماسپ)
۳۹۸۔ درویش محمد

۳۹۹۔ حسن بیگ دلیری (عہد شاہ عباس)
۴۰۰۔ مولانا درکی قمی
۴۰۱۔ دیانت رای کھتری
۴۰۲۔ دقیقی
۴۰۳۔ دایمی استر آبادی (۱۲۵)
۴۰۴۔ مولانا دوست سبزواری
۴۰۵۔ مرزا داؤد
۴۰۶۔ آغ خاں دیدہ (عہد محمد شاہی)
۴۰۷۔ شاہ دعای (۱۲۶)
۴۰۸۔ مولانا رفیع دستور (۱۲۷)
۴۰۹۔ ملا دانا کشمیری (عہد فرخ سیر)
۴۱۰۔ ہمت خاں دبیری (عہد عالمگیری)
۴۱۱۔ لالہ سروپ سنگھ دیوانہ
۴۱۲۔ شاہ اسمٰعیل ذبیح ذبحی (معاصر طاہر نصر آبادی) (۱۲۸)
۴۱۳۔ مرزا نقش ذوالقدر (عہد شاہ شجاع)
۴۱۴۔ سید ذوالفقار شروانی (م ۶۸۹ھ)
۴۱۵۔ ملا ذہنی
۴۱۶۔ ذوقی
۴۱۷۔ امینی ذوقی (عہد شاہ طہماسپ)
۴۱۸۔ ذوقی سمرقندی
۴۱۹۔ ذوقی اردستانی
۴۲۰۔ حیدر ذہنی (معاصر تقی اوحدی)
۴۲۱۔ ملا ذہکیی (۱۲۹)
۴۲۲۔ رودکی
۴۲۳۔ رضی الدین نیشا پوری
۴۲۴۔ رفیع الدین محمد
۴۲۵۔ رفیع الدین مسعود (م ۶۰۹ھ)
۴۲۶۔ رشید الدین محمد وطواط (م ۵۷۸ھ)
۴۲۷۔ رکن الدین
۴۲۸۔ عبدالکریم رافعی (م ۶۲۳ھ)
۴۲۹۔ عبدالرحیم خان خاناں رحیم (م ۱۰۳۳ھ)
۴۳۰۔ ملا روغنی (م ۹۸۰ھ)
۴۳۱۔ خواجہ راقم بخاری
۴۳۲۔ رفیع الدین محمد شیرازی
۴۳۳۔ مرزا محمد امین روح الدین (م ۱۰۴۰ھ)
۴۳۴۔ میر رضی اردبیلی (۱۳۰)
۴۳۵۔ رضای کشمیری (عہد شاہ جہاں)
۴۳۶۔ شاہ کاظم رابط (عہد عالمگیری)
۴۳۷۔ خواجہ محمد رضا (م ۱۰۷۵ھ)
۴۳۸۔ سیف الدین محمود رجای
۴۳۹۔ حکیم ابوبکر محمد علی الروحانی (عہد بہرام شاہ)
۴۴۰۔ محمد صالح رافع
۴۴۱۔ رضیہ شکستہ نویس (عہد شاہ عباس ثانی)
۴۴۲۔ شاہ رشید اکاشی
۴۴۳۔ گرگین بیگ رزمی (عہد شاہ عباس ثانی)

۴۴۴۔ احسن اللہ خاں راضی کشمیری (عہد محمد شاہی)

۴۴۵۔ جلال الدین محمد روحی (۱۳۱)

۴۴۶۔ محمد مسعود رافع (شاگرد ملا ساطع)

۴۴۷۔ غلام اشرف خاں رفعت (معاصر خوشگو) (۱۳۲)

۴۴۸۔ شیخ محمد علی رواج (م بعد ۱۱۴۰ھ)

۴۴۹۔ مولانا رضائی مشہدی

۴۵۰۔ استاد محمد رضا خوانساری

۴۵۱۔ ارشد علی رسائی (م ۱۱۴۴ھ)

۴۵۲۔ مرزا راضی (عہد شاہ عباس ثانی)

۴۵۳۔ رونق

۴۵۴۔ ربائی ہروی (عہد اکبر)

۴۵۵۔ ربائی سبزواری (معاصر تقی اوحدی)

۴۵۶۔ مولانا ربائی (عہد شاہ طہماسپ)

۴۵۷۔ رازی

۴۵۸۔ رشید الدین ہمدانی

۴۵۹۔ ملا رحمی

۴۶۰۔ رشید الدین احمد گازرونی

۴۶۱۔ مولانا روحی

۴۶۲۔ روحانی

۴۶۳۔ مولانا ریاضی سمرقندی

۴۶۴۔ رائی منوہر (عہد اکبری)

۴۶۵۔ رائی (۱۳۳)

۴۶۶۔ خواجہ حسام الدین رستم (م ۸۳۴ھ)

۴۶۷۔ رشکی ہمدانی

۴۶۸۔ حکیم رشدی قمی

۴۶۹۔ مولانا رضائی کاشانی (م ۹۰۸ھ)

۴۷۰۔ محمد رضائی حلبی

۴۷۱۔ آقا رضا (۱۳۴)

۴۷۲۔ میر رضی ہمدانی (معاصر اوحدی)

۴۷۳۔ قاضی رضی الدین اصفہانی (م ۱۰۲۱ھ) (۱۳۵)

۴۷۴۔ رونقی ہمدانی (۱۳۶)

۴۷۵۔ ملا رضوان شیرازی (عہد عالمگیری)

۴۷۶۔ مرزا محمد رضا (م ۱۰۷۵ھ)

۴۷۷۔ شیخ محمد ہادی رمزی

۴۷۸۔ رشیدی زرگر اصفہانی (عہد عالمگیری)

۴۷۹۔ حیدر روائی اکبرآبادی (عہد شاہ جہانی)

۴۸۰۔ رفیقا

۴۸۱۔ صالح رازی (۱۳۷)

۴۸۲۔ ملا ابراہیم رفعتی تبریزی (۱۳۸)

۴۸۳۔ رفیعی یزدی

۴۸۴۔ شاہ رمزی (عہد شجاع)

۴۸۵۔ رمزی شوستری (۱۳۹)

۴۸۶۔ سلطان علی بیگ رہی (عہد شاہ عباس ماضی)

۴۸۷۔ میر محمد زماں راسخ سرہندی (م ۱۱۰۰ھ)

۴۸۸۔ مرزا ایزد بخش رسا (م ۱۱۱۹ھ) (۱۴۰)

۴۸۹۔ نواب عاقل خاں رازی (م ۱۰۸۲ھ) (۱۴۱)

۴۹۰۔ میر محمد علی رائج (م بعد ۱۰۴۰ھ)

۴۹۱۔ مرزا احسن بیگ رفیع (عہد عالمگیری)

۴۹۲۔ سعد الدین راقم

۴۹۳۔ لالہ دیبی سہای رفیق (۱۴۲)

۴۹۴۔ ابو محمد رشیدی

۴۹۵۔ محمد رضا پاشائی (م بعد ۱۰۹۰ھ)

۴۹۶۔ رشید خاں (۱۴۳)

۴۹۷۔ زین الدین

۴۹۸۔ اسماعیل زایر

۴۹۹۔ خواجہ زکی یزدی

۵۰۰۔ زمانا بخواری (۱۴۴)

۵۰۱۔ آقا زمان زرکش قزوینی (۱۴۵)

۵۰۲۔ زلالی خوانساری

۵۰۳۔ قطب الدین زکی کاشغری (عہد سلطان سنجر)

۵۰۴۔ مولانا زالی

۵۰۵۔ مولانا زاری شیرازی (معاصر تقی اوحدی)

۵۰۶۔ بی بی زاری (معاصر تقی اوحدی)

۵۰۷۔ مولانا زجری (عہد شاہ طہماسپ)

۵۰۸۔ زلالی خراسانی

۵۰۹۔ ملا زلفی (عہد شاہ اسمٰعیل)

۵۱۰۔ زمانی یزدی (م ۱۰۰۱ھ)

۵۱۱۔ محمد زمان زمانی

۵۱۲۔ میر زندہ دل

۵۱۳۔ زینتی استرآبادی (معاصر تقی اوحدی)

۵۱۴۔ زین خاں کوکلتاش (عہد اکبری)

۵۱۵۔ مولانا زکی ہمدانی (عہد شاہ عباس)

۵۱۶۔ مرزا قاسم زاہد (عہد شاہ عباس ثانی)

۵۱۷۔ سعدی (م ۶۹۱)

۵۱۸۔ حکیم سنائی غزنوی (م ۵۲۵/۵۷۶ھ)

۵۱۹۔ حکیم سوزنی سمرقندی (م ۵۰۹ھ)

۵۲۰۔ سیف الدین (م ۵۷۰ھ)

۵۲۱۔ مولانا سائی (عہد شاہ طہماسپ)

۵۲۲۔ درویش سقا چغتائی

۵۲۳۔ سام مرزا

۵۲۴۔ محمود بیگ سالم (عہد شاہ طہماسپ)

۵۲۵۔ سروری (معاصر تقی اوحدی)

۵۲۶۔ عالم بیگ سروری (عہد جہانگیری)

۵۲۷۔ سروری یزدی (۱۴۶)

۵۲۸۔ سگ لوند (عہد شاہ عباس)

۵۲۹۔ سکندر مازندرانی (۱۴۷)

۵۳۰۔ مولانا کمال الدین سحابی استرآبادی (م ۱۰۰۱ھ)

۵۳۱۔ قاقلان بیگ سیاہی (عہد شاہ جہانی)

۵۳۲۔ حکیم سعید سرمد (م ۱۰۷۴ھ)

۵۳۳۔ سہراب بیگ سہراب

۵۳۴۔ مرتضی قلی بیگ (عہد شاہ عباس ثانی)

۵۳۵۔ سید صلابت خان سید (م ۱۱۳۷ھ)

۵۳۶۔ لالہ سکھ راج سبقت (۱۴۸)

۵۳۷۔ سالک کاشانی (معاصر تقی اوحدی)

۵۳۸۔ سالک یزدی

۵۳۹۔ محمد ابراہیم شاہ

۵۴۰۔ میر جلال الدین سیادت

۵۴۱۔ میر عبدالصمد سخن (م ۱۱۳۱ھ)

۵۴۲۔ حاجی فریدون سابق (عہد عالمگیری)

حواشی

(۱) تاریخ تذکرہ ہای فارسی ۷۲۵/۱ (۲) تذکرہ نویسی در ہند و پاک ص ۴۱۴ (۳) مصنف کی عبارت ہے: ''فقیر حقیر ضعیف الناس درگاداس بن مہتہ شیو شنکر ناگر''۔ ق ۳ (دیباچہ) (۴) سفینۂ عشرت ق (دیباچہ) (۵) ایضاً (دیباچہ) (۶) تاریخ تذکرہ ہای فارسی ۷۲۵/۱ (۷) سفینۂ عشرت ق ۵۱ (۸) ایضاً ق ۵۱ ب (۹) ایضاً ق ۱۴۹ س ۱۲ (۱۰) ایضاً ق ۲۱۲ س ۳ (۱۱) ایضاً ق ۱۱۵ س ۱۳ (۱۲) ایضاً ق ۱۴۰ س ۱ (۱۳) ایضاً ق (دیباچہ) (۱۴) ایضاً (۱۵) ایضاً (۱۶) ایضاً (در احوال اسدی طوسی) (۱۷) ''چند سال ہست کہ پا از زنجیر حیات بر آوردہ، سر بصحرای عدم نہاد'' (سفینۂ عشرت ق ۳۳ ب س ۱) (۱۸) مصنف سفینۂ عشرت نے احوال کے نام پر کچھ نہیں لکھا ہے صرف ایک شعر درج کیا ہے (ق ۳۳ ب س ۴) (۱۹) احوال ندارند، صرف دو شعر درج ہیں (ق ۳۳ ب س ۵) (۲۰) مصرعۂ تاریخ: تیغ اعجاز رسول اللہ سر باغی برید (سفینۂ عشرت ق ۳۳ ب س ۱۴) (۲۱) آصفی نے خود اپنا مصرعۂ تاریخ لکھا ہے:

سالی کہ رخ آصفی بہ ہفتاد نہاد ہفتاد تمام کرد و از پا افتاد

شد در ہفتاد در مصرعۂ تاریخت بیہودہ رو بقا بکام ہفتاد (ق ۳۴ س ۱)

(۲۲) مصرعۂ تاریخ، بادشاہ شعر ابو دہلی ۹۳۲ھ (سفینۂ عشرت ق ۳۶ س ۷) (۲۳) ہندوستان کے سفر میں گلبرگہ کے سلطان احمد بہمن کے یہاں باریاب ہوا تھا اور سلطان کی بنا کردہ ایک عمارت پر دو شعر کہا تھا جو اس عمارت کے دروازہ پر درج ہے، شعر ہے:

مبذا قصر ہمایوں کے زفرط عظمت آسمان پایگہ اول این درگاہ است

آسمان ہم نتوان گفت کہ ترک ادب است قصر سلطان جہان احمد بہمن شاہ است

(سفینۂ عشرت ۳۶ ب س ۱۲) (۲۴) مصرعۂ تاریخ: عروس علم و دین را مرد داماد (ق ۴۷ س ۶) (۲۵) شاہ عباس کے ایلچی یادگار علی سلطان کے ہمراہ ہندوستان آیا اور یہیں رہ گیا (ق ۴۷ ب س ۵) (۲۶) خود عشرت نے لکھا

ہے ''احوالش معلوم نیست''، صرف ایک شعر درج کیا ہے (ق ۴۷ ب س ۷) (۲۷) ''دیگر یست واحوال او نیز نامعلوم'' ایک شعر مرقوم ہے (ق ۴۷ ب س ۸) (۲۸) ''در ہند آمدہ با شیخ ابوالفضل محشور بود'' (ق ۴۷ ب س ۱۵) (۲۹) پورا نام عماد الدین محمود بن میر محب اللہ ہے۔ ۱۰۲۰ھ میں ہندوستان آیا (ق ۴۸) (۳۰) صدر الدین محمد نام اور مرزا محمد حکیم سے مشہور ہیں، عنفوان شباب میں ہندوستان آیا (ق ۴۸) (۳۱) ہندوستان کا سفر کیا تھا (ق ۴۸) (۳۲) احوال ندارد، صرف ایک شعر درج ہے (ق ۴۸) (۳۳) ہندوستان آیا اور یہیں اس کی موت واقع ہوئی (ق ۴۹) (۳۴) برادر زادۂ نور جہاں بیگم (ق ۴۹) (۳۵) بندرابن خوشگو کے دوستوں اور معاصروں میں تھے (ق ۴۹) (۳۶) محمد طاہر تذکرہ نویس کے معاصر تھے (ق ۴۹) (۳۷) جونپور میں گھوڑے سے گر کر ان کی موت واقع ہوئی تھی (ق ۴۹) (۳۸) ''در خدمت میر مشق سخن می گزرانید'' (ق ۴۹ ب) (۳۹) ''مدتی از وارد ہند شد'' (ق ۴۹ ب) (۴۰) احوال ندارد (ق ۵۰) (۴۱) ''در ہزار و صد و چہل و چند دعوی حق را لبیک اجابت گفت'' (ق ۵۰) (۴۲) احوال و کلام ندارد (ق ۵۰ ب) (۴۳) احوال ندارد (ق ۵۰ ب) (۴۴) ''بہ ہند آمدہ (ق ۵۰ ب) (۴۵) میاں ناصر علی کے دوستوں میں تھے (ق ۵۱) (۴۶) ۱۱۷۵ھ میں باحیات تھے، عشرت نے اسے سلامتی کی دعا دی ہے ''خدایش سلامت دارد (ق ۵۱ ب) (۴۷) ۱۱۷۵ھ میں باحیات تھے ''حق تعالیٰ سلامتش دارد'' (ق ۵۱ ب) (۴۸) ۱۱۷۵ھ سے قبل بنارس میں مقیم ''چند سالیست کہ وارد بنارس گشتہ (ق ۵۱ ب) (۴۹) ''چند سالیست کہ بعالم جاودانی شتافت''، ''وارد ہندوستان بہشت نشان گردید'' (ق ۵۳) (۵۰) مصرعۂ تاریخ، لفظ بے مثل (ق ۶۳) (۵۱) پسر میانہ عالمگیر بادشاہ، اردو و فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے (ق ۶۸ ب س ۱۴) (۵۲) وارد ہندوستان، ظفر احسن کے معاصر تھے (ق ۶۹ ب) (۵۳) ابوطالب کلیم کے زمانے میں ہندوستان آیا (ق ۶۹ ب) (۵۴) شاہ لاڈلا بلگرامی سے مشہور (ق ۶۹ ب) (۵۵) بہ ہند آمدہ (ق ۷۰) (۵۶) محمد قلی نام، ہندوستان آیا تھا (ق ۷۰) (۵۷) بہ ہند آمدہ (ق ۷۰) (۵۸) برادر کلاں میر محمد افضل ثابتؔ، مصرعۂ تاریخ، حیف الفت در جہاں باقی نماند (ق ۷۰ ب) (۵۹) ولد حسین ساوجی، بہ ہند آمدہ (ق ۷۰ ب) (۶۰) برادر ملک حمزہ سیستانی (ق ۷۰ ب) (۶۱) عہد شاہ جہانی میں ہندوستان آیا (ق ۷۱) (۶۲) ''احوالش معلوم نیست'' (ق ۷۱) (۶۳) بہ ہند آمدہ (ق ۷۱) (۶۴) احوال ندارد (ق ۷۱) (۶۵) احوال ندارد (ق ۷۱) (۶۶) مصرعۂ تاریخ، پی تاریخ او کز بی کسی رفت۔ روان گفتم ز عالم اقدسی رفت (حکیم رکن الدین مسیحی) (ق ۷۱ ب) (۶۷) دوبارہ شامل ہو گیا ہے، قبلاً ق ۳۳ ب پر بھی اس کا تذکرہ کیا ہے دونوں جگہ حالات سے متعلق عبارت یکساں ہے البتہ اشعار میں فرق ہے

(۶۸) ''نزل غیب'' تاریخ تولد یافتند (ق ۷۳) (۶۹) ''احوالش جای ندیدہ'' (ق ۱۰۷) (۷۰) بہ ہند آمدہ (ق ۱۰۷) (۷۱) نیک وبد احوالش بنظر نیامدہ'' (ق ۱۰۸) (۷۲) ''احوالش معلوم نیست'' (ق ۱۰۸) (۷۳) ''سال ہزار وصد وچند پیام مرگ بگوششہ رسید'' (ق ۱۰۸) (۷۴) بہ ہند آمدہ (ق ۱۰۸) (۷۵) ''دیگر احوالش معلوم نیست'' (ق ۱۹۰) (۷۶) ''احوالش نیز نامعلوم'' (ق ۱۰۹) (۷۷) مصرعۂ تاریخ، باقی باللہ شد بیرنگ در بزم بقا۔ شاعر خوش سلیقہ وخوب گو بود (خیر اللہ ندا) (ق ۱۲۳) (۷۸) احوال ندارد (ق ۱۲۴ ب) (۷۹) ''مولانا قاسم درویش لفظ انتخاب، تاریخ ولادت آن انتخاب جزو زمان یافت، سراج الدین علی خاں آرزو تاریخ وفاتش بطریق تعمیہ یافتہ، رفت بیدل زغم آباد جہاں (ق ۱۲۵) (۸۰) درگاداس عشرت کے دوستوں میں تھے۔ ''وبااین خاکسار صدیق دیرینہ بود'' (ق ۱۴۰) (۸۱) بہ ہند آمدہ (ق ۱۳۶) (۸۲) ''بہ ہند آمدہ ...... بعد ازان بوطن رفت تا سال ہزار و ہشتاد و ہفت وقید حیات بود'' (ق ۱۴۸) (۸۳) ہندوستان کے مختلف شہروں لاہور، آگرہ اور گجرات کا سفر کیا (ق ۱۴۸ ب) (۸۴) ایرانی النسل، نشو ونما ہندوستان میں ہوئی (ق ۱۴۸ ب) (۸۵) بہ ہند آمدہ (ق ۱۴۹) (۸۶) ''چند سالہا ست کہ در سری متھرا کیاوش نصیب شدند'' (ق ۱۴۹) عشرت کے استاد تھے (۸۷) برادر ارباب بیگ جویا (ق ۱۵۰ ب) (۸۸) بہ ہند آمدہ مصرعۂ تاریخ، ملا کاشی سبزواری عبارت ''سخنور نیک'' تاریخ وفاتش یافت'' (ق ۱۵۱) (۸۹) مصرعۂ تاریخ، ولفظ ثابت کردہ بند را ابن خوشگو تذکرہ نویس تاریخش گفتہ (ق ۵۳ ب) (۹۰) ''احوالش بنظر نیامدہ'' (ق ۱۶۱ ب) (۹۱) احوال ندارد (ق ۱۶۲) (۹۲) برادر کلائی رای پران آرام مزید احوال واشعار ندارد (ق ۱۶۲) (۹۳) مصرعۂ تاریخ ''خسرو ہند'' (ق ۱۶۲ ب) (۹۴) مصرعۂ تاریخ ''اشعار و لفریب'' (ق ۱۶۳) (۹۵) آخر عمر میں ہندوستان آیا اور ایک عرصہ لاہور میں قیام پذیر رہا (ق ۱۶۶ ب) (۹۶) گولکنڈہ میں قیام رہا (ق ۱۶۶ ب) (۹۷) بدخشاں سے ہندوستان کا رخت سفر باندھا اور فرخ سیر کے ابتدائی دور میں عین جوانی میں وفات ہوئی (ق ۱۶۶ ب) (۹۸) احوال ندارد (ق ۱۶۷) (۹۹) احوال ندارد (ق ۱۷۲ ب) (۱۰۰) احوال ندارد (ق ۱۷۴ ب) (۱۰۱) مصرعۂ تاریخ، واین مصرعۂ تاریخ فوت اوو فہمی است ۔ بسالی مردہ حاتم بعد فہمی (ق ۱۸۱ ب) (۱۰۲) احوال ندارد (ق ۱۸۲) (۱۰۳) ''آخر بااز اصفہان بہ ہند آمدہ'' (ق ۱۸۲) (۱۰۴) ''در ہند ماندہ'' (۱۸۲) (۱۰۵) احوال ندارد (ق ۱۸۲) (۱۰۶) احوال ندارد (ق ۱۸۲) (۱۰۷) عنفوان شباب میں بعہد جہانگیر ہندوستان آیا اور عہد عالمگیری کے ابتدائی دور تک باحیات تھا (۱۰۸) محمد سعید اشرف کے بھائی، ہندوستان آکر نواب ابراہیم خاں پسر علی مردان خاں سے متعلق رہے (ق ۱۸۲) (۱۰۹) فیضی کے

دوست واحباب میں تھے انہوں نے ان کی تاریخ وفات لکھا: ''فضایل نیاحمی کہ تاریخ فوتش توان یافتن از فضایل نیاحمی'' (ق ۱۸۴ ب) (۱۱۰) بہ ہند آمدہ (ق ۱۸۴ ب) (۱۱۱) تین دفعہ عراق سے ہندوستان آیا (ق ۱۸۵ ب) (۱۱۲) ''احوالش معلوم نیست'' (ق ۱۸۵ ب) (۱۱۳) سال وفات میں اختلاف ہے بقول دولت شاہ ۵۸۸ھ اور بقول صاحب ہفت اقلیم ۲/۱۷۴/۳ ۵۸۲ھ اور ایک قول کے مطابق ۵۸۳ھ ہے۔ مصرعۂ تاریخ لفظ بے مثال (ق ۲۰۶ ب) (۱۱۴) ۱۰۱۶ھ میں ہندوستان آیا (ق ۲۰۹ ب) (۱۱۵) ۱۰۰۰ھ کے اواخر میں ہندوستان آیا (ق ۲۰۹ ب) (۱۱۶) احوال ندارد (ق ۲۱۰) (۱۱۷) ''احوالش بنظر نیامدہ'' (ق ۲۱۲ ب) (۱۱۸) ''احوالش معلوم نیست'' (ق ۲۱۲ ب) (۱۱۹) ہندوستان آکر شاہجہاں کے یہاں ملازمت اختیار کی (ق ۲۱۳) (۱۲۰) برادر زادۂ حاجی محمد خان قدسی (ق ۲۱۳) (۱۲۱) ''احوالش معلوم نیست'' (ق ۲۱۳) (۱۲۲) میر عبد الجلیل بلگرامی تاریخش گفتہ ۔ آوآو امتیاز خاں ۱۱۳۲ھ (۲۱۳) (۱۲۳) احوال ندارد (ق ۲۱۷) (۱۲۴) ولد ضمیری اصفہانی، تاریخ وفات اونفس سوزیست (ق ۲۲۱) (۱۲۵) ''احوالش معلوم نیست'' (ق ۲۲۳) (۱۲۶) احوالش نامعلوم'' (ق ۲۲۳) (۱۲۷) عہد جہانگیری میں ہندوستان آیا (ق ۲۲۳) (۱۲۸) بہ ہند آمدہ (ق ۲۲۴) (۱۲۹) ''احوالش معلوم نیست'' (ق ۲۲۷) (۱۳۰) احوال ندارد (ق ۲۲۹) (۱۳۱) ''احوالش معلوم نیست'' (ق ۲۲۹ ب) (۱۳۲) ''احوالش معلوم نیست'' (ق ۲۳۰) (۱۳۳) ''احوالش معلوم نیست'' (ق ۲۳۱) (۱۳۴) ''احوالش معلوم نیست'' (ق ۲۳۱ ب) (۱۳۵) بہ ہند آمدہ (ق ۲۳۱) (۱۳۶) بہ ہند آمدہ (ق ۲۳۲) (۱۳۷) عہد شاہجہانی میں ہندوستان آیا اور گولکنڈہ میں اقامت گزیں ہوا (ق ۲۳۲ ب) (۱۳۸) بہ ہند آمدہ (ق ۲۳۲ ب) (۱۳۹) بہ ہند آمدہ (ق ۲۳۲ ب) (۱۴۰) مصرعۂ تاریخ ۔ کہ رسا رفتہ از جہان بجہانی (میرزا حاتم بیگ) (ق ۲۳۴) (۱۴۱) مرزا بیدل نے ان کی تاریخ وفات میں ایک غزل کہا ہے جس کا ہر مصرعہ تاریخ ہے ۔

والی سخن سخنان نماند تکیہ گاہ عرفان نماند

مجمع استاد بی شیرازہ شد مہدی جم جاہ عاقل خان نماند (ق ۲۴۲ ب)

(۱۴۲) احوال ندارد (ق ۲۴۴) (۱۴۳) احوال ندارد (ق ۲۴۴ ب) (۱۴۴) عہد شاہجہانی میں ہندوستان کا سفر کیا (ق ۲۴۵ ب) (۱۴۵) عہد عالمگیری میں ہندوستان آیا اور یہیں انتقال کیا (ق ۲۴۶) (۱۴۶) ہندوستان کے سفر میں دکن گیا (ق ۲۴۹ ب) (۱۴۷) در ہند آمدہ (ق ۲۵۰) (۱۴۸) مصرعۂ تاریخ

ع بائی سکھ راج زما سبقت کرد (حکم چند ندرت) ق ۲۵۳)

اخبار علمیہ

قیاس واجتہاد کی طرح استحسان بھی اسلامی فقہ وقانون کا ایک اہم اصول ہے جس کو فقہائے احناف نے خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے، امام ابن تیمیہؒ نے بھی اپنی تصانیف میں اس نام کے اپنے ایک رسالہ کا ذکر کیا ہے اور ان کے تلامذہ و منتسبین اور سوانح نگاروں نے بھی ان کے اس رسالہ کے نام کی نشاندہی کی ہے مگر امام صاحب کا یہ رسالہ ناپید تھا۔

حال ہی میں جامعہ سلفیہ بنارس کے ایک سابق اور لائق طالب علم، عربی زبان کے اچھے اسکالر اور شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ کے علوم و معارف کے شیدائی ڈاکٹر عزیر شمس صاحب کو یہ رسالہ کسی طرح دستیاب ہو گیا تو انہوں نے بڑی محنت و جانفشانی سے اسے ایڈٹ کر کے تحقیق و تحشیہ کے بعد دار عالم الفوائد (مکہ مکرمہ) سے شائع کیا ہے، فہرست سمیت اس میں کل ۱۵۲؍ صفحات ہیں، ابتدائی ۶۷؍صفحات فاضل محقق کے مفید عالمانہ مقدمہ پر مشتمل ہیں، اس میں اس نسخہ کی دریافت ودستیابی اور شیخ الاسلام کے خط وطرز بیان پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ اس کے متن کی تصحیح میں ابن تیمیہؒ کی دوسری مطبوعہ ومخطوطہ کتابوں سے مدد لی گئی ہے، ان کے خیال میں یہ مخطوطہ ابن تیمیہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ جس کا عکس ۱۱۷ تا ۱۴۴ صفحے پر دیا گیا ہے۔

امام ابن تیمیہ کے قدردانوں اور علوم فقہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ رسالہ نعمت غیر مترقبہ ہے، ڈاکٹر محمد عزیر شمس اس کی اشاعت پر اہل علم کے شکریے کے مستحق ہیں۔

یروشلم کے آس پاس ایک کتبہ ملا ہے جس کے پتھر پر یہ مرقوم ہے "James, son of Joseph, brother of Jeusus." اس کی زبان اور رسم خط سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۲۰۰۰ سال پہلے کی تحریر ہے، ایک فرنچ محقق کے خیال میں یہ حضرت عیسیٰ مسیح سے متعلق دریافت شدہ سب سے

قدیم کتبہ ہے، اسکالر کا یہ تجزیہ بائبلیکل آرکیالوجی میگزین میں اس ہفتہ میں شائع ہوا ہے۔

اگر یہ کتبہ مستند اور واقعی نصارت کے عیسیٰ مسیح سے متعلق ہے تو یہ بائبل کے باہر حضرت عیسیٰ کے متعلق پہلی دستاویز ہے جو مذکورہ میگزین کے مطابق انجیل کی مصدق ہے، اس میں مرقوم ہے:۔

'' آثار قدیمہ کا یہ پہلا انکشاف ہے جو عیسیٰ مسیح کے متعلق انجیل کے حوالوں کی تصدیق کرتا ہے''۔

بعض دوسرے محققین نے محتاط ردعمل ظاہر کیا ہے، ان کے خیال میں یہ دریافت اہم اور سنسنی خیز ہے لیکن اس کا ربط و تعلق عیسائیت کی مرکزی شخصیات سے ہونا یقینی نہیں، اس انکشاف میں جعل وفریب دہی کے امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اسرائیل کے جیالوجیکل سروے کی تفتیش کے مطابق اس میں ایسی کوئی علامت نہیں جس سے اندازہ ہو کہ اس نو دریافت تحریر میں جدید رنگ کی آمیزش کی گئی ہو یا اس کی کھدائی یا تراش خراش میں جدید آلات کا استعمال کیا گیا ہو یا اس میں کسی طرح کی تبدیلی کی کوشش کی گئی ہو، تحریر کے ساتھ کسی حیاتیاتی باقیات کی عدم موجودگی کے سبب ریڈیو کاربن ڈیٹنگ کا طریقہ بھی اس کی کھدائی اور تراش خراش کی تاریخ معلوم کرنے میں ناکام نظر آتا ہے، تاہم تدفینی صندوق میں ۲۰؍ انچ لمبے چونے کے پتھر پر تراشے گئے الفاظ وغیرہ یہودیوں کے ان تدفینی صندوقوں کے مشابہ ہیں جو ایک صدی قبل مسیح اور بعد مسیح میں استعمال کئے جاتے تھے۔

فرنچ اسکالر کا کہنا ہے کہ اس کتبہ کے انداز تحریر اور لفظوں کی ہیئت وشکل کچھ اس طرح کی ہے کہ یہ تحریر ۷۰ء عیسوی میں یروشلم کی تباہی و بربادی سے پہلے کی آخری دہائیوں کی معلوم ہوتی ہے۔

بائبل کے عالموں نے اپنے انٹرویو میں کہا ہے کہ حالات وقرائن سے محولہ بالا تحریر کا عیسیٰ مسیح سے تعلق مستحکم معلوم ہوتا ہے تاہم یہ صرف قرائن ہیں، ثبوت نہیں، اگرچہ اس زمانہ میں وہاں جیمس (یعقوب) جوزف (یوسف) جیسس (عیسیٰ) وغیرہ نام عام طور سے رکھے جاتے تھے۔

آرامی زبان میں بریل بکس (تدفینی صندوق) پر تراشے گئے الفاظ "Ya,akov bar

"yosef akhui di yeshua" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صندوق میں کبھی اس شخص کی ہڈیاں (نعش) رکھی گئی تھیں جس کا نام جیمس تھا اور جو پہلی صدی عیسوی میں فوت ہوا تھا، انجیل میں کئی جگہوں پر اس بات کا تذکرہ ہے کہ عیسیٰ مسیح کے ایک بھائی جیمس تھے جو حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہونے کے بعد یروشلم میں عیسائی فرقہ کے رہنما بن کر ابھرے۔

اس مضمون میں یہ بھی تحریر ہے کہ ایک یہودی مؤرخ جوزفس کے بیان کے مطابق جیمس کی موت سنگساری کے ذریعہ واقع ہوئی تھی۔

مظفر نگر۔ جھمپا فرم کے مالک بھولا ناتھ جھا کا بیان ہے کہ آم کی فصل کسی موسم کی پابند نہیں ہے، ان کا کہنا ہے کہ ان کے باغ میں بارہ ماسی آم کا درخت سال بھر پھل دیتا ہے، اس پیڑ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی شاخیں مختلف اوقات میں پھل دیتی ہیں، بعض شاخوں میں پھل ہوتا ہے تو دوسری شاخوں میں بور، اس طرح ایک ہی وقت میں بور اور پھل دونوں آتے ہیں۔

بھولا ناتھ پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ آم جون اور جولائی میں پکتے ہیں، اگر اس کے بعد ہی جب پیڑوں میں بور نہ ہو باغ کی کھدائی اور سینچائی کردی جائے اور سال میں دو یا تین بار کھاد ڈالی جائے تو اس کی فصل اچھی ہوسکتی ہے، اس کی قلمیں مقامی نرسریوں میں بر وقت دستیاب ہیں جن کو کسی اندیشے کے بغیر ہر موسم میں لگایا جاسکتا ہے۔

مالکہ، الفانزو، دسہری اور چوسہ وغیرہ کی پیداوار شمالی بہار میں اچھی ہوتی ہے تاہم ان کی فراہمی یا دستیابی مشکل ہے، مالکہ اور الفانزو کی برآمدات زیادہ ہوتی ہیں اور ان کا ذائقہ بہتر اور دیرپا ہوتا ہے، شمالی بہار کے کسان ان کو زیادہ لگاتے ہیں اور اچھی پیداوار حاصل کرتے ہیں، کیسر راجستھان کے آم کی ایک خاص قسم ہے جو مہاراشٹر میں پسند کی جاتی ہے، ان کی قلمیں ارزاں داموں پر دستیاب ہیں۔ (ماخوذ از: ٹائمس آف انڈیا، ۲۵؍اکتوبر ۲۰۰۲ء)

ک۔ ص۔ اصلاحی

باب التقریظ والانتقاد

کچھ یادیں کچھ باتیں

از پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری، متوسط تقطیع، کاغذ طباعت عمدہ، کتابت کمپیوٹر، صفحات ۳۳۶ مجلد مع خوبصورت گردپوش، قیمت ۲۵۰ روپے، پتہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۳۱۰۸ وکیل اسٹریٹ، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔۶۔

پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری بین الاقوامی شہرت کے حامل سائنس داں اور ماہر علم الحیوانیات ہیں، شروع میں ان کو اپنی مادری زبان اردو سے یک گونہ شغف تھا اور اس کی قدرے تحصیل بھی کی تھی لیکن سائنس کی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد وہ اس کی نت نئی تحقیقات و اکتشافات میں ایسا محو ہوئے کہ اردو غریب پس پشت چلی گئی اور بقول اکبرالہ آبادی ؎

عشرتی گھر کی محبت کا مزا بھول گئے — کھا کے لندن کی ہوا عہد وفا بھول گئے

لیکن سائنس کے لئے تمام تر وقف ہوجانے کے بعد انہوں نے اس میدان میں گوناگوں ناقابل فراموش کارہائے نمایاں انجام دئے، اپنے مخصوص تحقیقی موضوع نماٹولاجی میں تقریباً دو درجن کتابیں اور کئی صد بلند پایہ مقالات لکھے جو یورپ کے مؤقر و معتبر جرائد و رسائل کی زینت بنے، اپنے فن میں وہ متعدد بڑا سے بڑا ایوارڈ حاصل کرتے رہے جس کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

عربی کا مشہور مقولہ ہے کل شیئ یرجع الی اصلہ (ہر چیز کی بازگشت اپنے اصل کی طرف ہوتی ہے) سائنس میں فتوحات اور ایک سے بڑھ کر ایک کارنامہ انجام دینے کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ صدر جمہوریہ ہند نے جنوری ۱۹۹۸ء میں انہیں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا تو اردو کے دن پھر آئے اور اب وہ شمیم صاحب کی سرگرمیوں کی جولان گاہ اور تقریباً ۵ برس سے اس کا فروغ اور اردو یونیورسٹی کی توسیع و ترقی ان کے شب و روز کا مشغلہ ہے اور یہی ان کی تقریر و تحریر کی خاص زبان بھی ہوگئی ہے۔

چند برس قبل یونیورسٹی کے تعلق سے ''ابھرتے نقوش'' کے نام سے شمیم صاحب کی کتاب

آئی اور اب " کچھ یادیں اور کچھ باتیں " کے نام سے یہ دوسری کتاب شائع ہوئی ہے جس کی تقریب
پہلے مضمون میں مفصل بیان کی گئی ہے، دوسرے مضمون میں خودنوشت حالات ہیں، اس میں بچپن،
گھر اور گاؤں کے ماحول، اس زمانے کے شوق، دلچسپیوں، مشاغل اور ابتدائی اور اعلا تعلیم کی مفصل
داستان سنائی ہے، اس میں ہاسٹل کی زندگی کا نقشہ بھی کھینچا ہے، مختلف تعلیمی شعبوں کا حال اور
زولوجی ڈپارٹمنٹ کے امتیازات وغیرہ کا دلچسپ تذکرہ بھی کیا ہے، شمیم صاحب نے حصول علم میں اپنی
غیر معمولی جدوجہد، یکسوئی، لگن، محنت اور جان فشانی کا ذکر مزہ لے لے کر جس موثر اور سبق آموز
انداز میں کیا ہے وہ دوسرے طالب علموں کو بھی دعوت فکر وعمل دیتا ہے، تعلیمی میدان میں ترقی پر
ترقی حاصل کرنے کے باوجود وہ اپنی کسی خاص کامیابی پر مطمئن اور قانع نہیں ہوئے بلکہ اس سے
انہیں اور بھی محنت کرنے کی تحریک ملی اور وہ اس سے بڑی کامیابی کے حصول میں منہمک ہوگئے
کیونکہ علامہ اقبال کے بہ قول ع ہمت عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول

پروفیسر رشید احمد صدیقی کی طرح وہ بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر دل وجان سے فدا ہیں اور
جہاں موقع ملتا ہے اس کے گن گانے لگتے ہیں لیکن علی گڑھ یونیورسٹی کے موجودہ رجحانات وحالات کو
جب اپنے زمانے جیسا نہیں دیکھتے یا اس میں اور دوسری یونیورسٹیوں میں بھی معیار کی پستی اور طلبہ و
اساتذہ کی تن آسانی اور آرام طلبی دیکھتے ہیں تو بہت دل گیر اور افسردہ ہوکر کہتے ہیں " نئی نسل میں
ریسرچ کی اہمیت، افادیت اور یہاں تک کہ اس کا Charm بھی ختم سا ہو رہا ہے…… اور اب یہ
سوال کھڑا ہوگیا ہے کہ کیا اکیسویں صدی میں ہندوستانی یونیورسٹیوں سے جدید سائنس کی ترقی اور
تحقیق کا خاتمہ ہوجائے گا، حالات اور واقعات کے مشاہدے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ
راتوں رات دولت مند بننے کی خواہش اور ہوس تعلیمی و تخلیقی زندگی پر حاوی ہوگئی ہے اور عارضی طور
پر چاہے بھلے ہی یہ صورت حال خوش نما نظر آئے مگر ان بدلتی ہوئی ترجیحات کی ہم کو بھاری قیمت
چکانی پڑے گی" ۔ (ص ۵۳)

ایک جگہ ان کی دردمندی یہ لکھنے پر ان کو مجبور کرتی ہے کہ " ہمارے طالب علمی کے دور میں
ریسرچ کے لئے بیرون ملک جانے کی خواہش جنون کی حد تک ہوتی تھی، مسلم یونیورسٹی کے زولوجی
ڈپارٹمنٹ میں ہم کو یہ بتایا جاتا تھا کہ جب تک کوئی لکچرر دو یا تین برس کے لئے امریکہ، جرمنی یا

برطانیہ کا دورہ نہیں کرلیتا تھا ہمارے ڈپارٹمنٹ کے سربراہ اس کو ریڈر نہیں بناتے تھے مگر آج سب
کچھ یکسر بدل گیا ہے اور ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں یہ چلن عام ہوگیا ہے کہ جیسے ہی کوئی لکچرر
مستقل ہوا وہ لیبیا، کویت، سعودی عربیہ، ملیشیا، متحدہ عرب امارات یا کچھ نہیں تو یوگانڈا، کینیا،
نائیجیریا جانے کی تگ ودو میں لگ جاتا ہے اور اس کا واحد مقصد دولت کمانا ہوتا ہے، تعلیم وتحقیق
بالکل نہیں، اس طرح دولت دماغ کی طاقت پر حاوی ہوگئی ہے اور تعلیم بھی اب ایک بڑی
تجارت بن گئی ہے، ہمارے دور میں تو اساتذہ نہ مادیت پرست تھے اور نہ ہی دولت کے خواہاں،
اب حالات بالکل اس کے برعکس ہیں اور ہماری نسل کے لوگ تو دو انتہا پسندانہ رجحانات میں گھر گئے
ہیں اور دونوں کو حاصل کرلینا چاہتے ہیں" ۔ (ص ۶۳)

اپنے خودنوشت حالات میں ایک جگہ مسٹر ٹی این سیشن کا ذکر اس تقریب سے کیا ہے کہ
وزارت ماحولیات و جنگلات کے سکریٹری کی حیثیت سے ان ہی کے اشارے پر شمیم صاحب کا
انتخاب زولوجیکل سروے آف انڈیا کے ڈائرکٹر کے عہدے پر ہوا تھا، ان کے متعلق شمیم صاحب کے
یہ تاثرات قارئین کے ملاحظہ میں بھی آنے کے لائق ہیں " وہ حالیہ برسوں میں ایک بہت لائق منتظم،
بااصول وسخت افسر، بے خوف، جرأت مند اور خوداعتمادی سے بھرپور سیول سرونٹ کی حیثیت سے کافی
مشہور ہوئے اور جب وہ چیف الیکشن کمشنر بنے تو پہلی بار سیاست دانوں کے دلوں میں جواب دہی
کا خوف پیدا ہوا، اپنی اہلیت، صلاحیت اور اختیارات کا استعمال کرکے اپنے جانشینوں کے لئے ایک
مثال قائم کی…… وہ جس جگہ بھی رہے اپنی ایک چھاپ چھوڑی اور چیف الیکشن کمشنر کی حیثیت سے
تو وہ ہمیشہ ہی یاد کئے جائیں گے" ۔ (ص ۵۷)

دراصل وہ خود محنت اور کام میں لگن کے عادی ہیں اور اسی جذبہ کی پرورش دوسروں میں
بھی کرنا چاہتے ہیں، اپنے بارے میں ان کا یہ لکھنا " صرف زیادہ محنت سے ہی مجھے اپنی ذمہ داریاں
نبھانے میں ایک امتیاز حاصل ہوا اور زندگی میں ایک مقام ملا"، (ص ۶۸) بیجا نہیں۔

خودنوشت حالات کے بعد انہوں نے مختلف طبقوں کے چند بہت ہی ممتاز افراد کے خاکے
لکھے ہیں اور ان پر ان کی نظر انتخاب اسی لئے پڑی کہ انہوں نے اپنی محنت ومجاہدہ سے اپنی دنیا آپ
تعمیر کی تھی اور امتیاز حاصل کرنے اور اپنا مقام پیدا کرنے کے لئے کسی اور کے رہین منت نہیں

ہوئے تھے، بلکہ علامہ اقبال کی طرح ان کا بھی اس پر اعتقاد تھا کہ:

جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں   جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں

شمیم صاحب نے جن اشخاص کے متعلق اپنے نقوش وتاثرات قلم بند کئے ہیں وہ تین طرح کے ہیں، پہلے طبقے میں اپنے دو عزیزوں مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری اور مولانا عبدالسلام ندوی کا تذکرہ کیا ہے، یہ دونوں متبحر عالم اور اردو کے نامور مصنف، محقق اور ممتاز اہل قلم تھے، اول الذکر ان کے جد بزرگوار تھے، ان کے ذکر کے شروع میں ان کے والد بزرگوار یعنی مصنف کے پردادا اور جمعیۃ اہل حدیث کے سرخیل عالم اور ریاست بھوپال کے ناظم تعلیمات مولانا سلامت اللہ جیراجپوری کا بھی تذکرہ آگیا ہے، شمیم صاحب کے اس مضمون کا انفرادی پہلو یہ ہے کہ انہوں نے اپنے بچپن کے زمانے کے دادا کے ایسے چشم دید حالات وواقعات لکھے ہیں جو عام طور پر لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تھے، اس کے علاوہ انہوں نے مولانا کے فضل وکمال سے زیادہ ان کی سادگی، درویشی، خاکساری اور بے تکلفی کا نقشہ کھینچا ہے، دوسرا مضمون شمیم صاحب کے رشتے کے نانا اور دارالمصنفین کے رکن رکین مولانا عبدالسلام ندوی پر ہے جس میں اپنے بچپنے کے مشاہدات اور چشم دید واقعات بیان کرکے مولانا کے مسلمہ علم وکمال اور ذہانت وفطانت پر مہر تصدیق ثبت کی ہے، اشخاص پر دوسری نوعیت کے مضامین میں قوم وملت کے جن مشاہیر اور ملک و وطن کی مایہ ناز ہستیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان کے نام یہ ہیں:۔

حکیم عبدالحمید، سید حامد، سید ہاشم علی اختر، افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کرنولی اور ڈاکٹر محمد اسحاق جم خانہ والا۔

حکیم عبدالحمید مرحوم کو بیسویں صدی کی عظیم اور منفرد شخصیت قرار دینے کے بعد ان کی سیرت وشخصیت کا تجزیہ بڑی گہرائی سے کرکے جو کچھ بتایا ہے، اس کا لب لباب یہ ہے، ''انہوں نے پوری جاں فشانی اور لگن کے ساتھ انتھک کوشش کی، اپنے پیشے سے بے انتہا لگاؤ کی وجہ سے اتنے مصروف رہے کہ کبھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا، اختلاط سے پرہیز، گوشہ گیری اور تنہائی پسند، خود اعتمادی سے پُرعملی، باہمت اور دوراندیش انسان، بہت غور وفکر اور کافی پلاننگ کے بعد کام شروع کرتے، کام شروع کرنے سے پہلے مضبوط منصوبہ بندی اور صورت گری کرتے، ان کے آگے بڑھے قدم

پیچھے نہ ہٹتے، بحث وتکرار سے پرہیز اور اپنی بات پر اصرار نہ کرتے، ان کی کامیابی کا راز ان کے کام کرنے کی لگن، مستقل مزاجی اور انتھک محنت کا جذبہ تھا، جس کام کو لیا پایۂ تکمیل کو پہنچایا، خودنمائی، خودستائی اور چمک دمک سے ہمیشہ دور رہے، تضیع اوقات ناپسند تھا، طبیعت میں بے حد سادگی، سیاست سے دور، منحنی مگر آہنی جسم اور ارادوں کے مالک، روپے پیسے کے پیچھے نہ بھاگے وغیرہ''۔

سید حامد صاحب کا سراپا اور ان کے ''میر کارواں'' ہونے کی حقیقت تو اس شعر ہی نے نمایاں کردی جس کو عنوان بنایا گیا ہے۔

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پر سوز   یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

حامد صاحب کی چند مزید خوبیاں، شمیم صاحب کے تجزیے کے مطابق: فیصلے پر اٹل، نظریے پر پختہ، تصنع اور مصلحت سے عاری، اپنی شخصیت کو غیر ضروری طور پر نمایاں نہ کرنا، عام لوگوں کے برخلاف چھوٹے چھوٹے کام کرکے اپنے قد کو اونچا نہ کرنا، اصول پسندی، دوراندیشی، قوم کی بدحالی کا غم، پرواز میں کوتاہی لانے والے کاموں کو ٹھکرا کر ضمیر کے مطابق کام کرنا، جس ادارے سے متعلق رہے، اس پر اپنی گہری چھاپ ڈالی، کوچنگ سنٹر کی منفرد پہچان بنائی وغیرہ۔

اسی طرح جن مشاہیر کا تذکرہ کیا ہے ان کی سیرت وشخصیت کا عطر کشید کرکے دکھایا ہے کہ وہ سب سراپا عمل، سراپا اخلاص اور نہایت متحرک، فعال اور بے لاگ تھے، تیسرے نوع کے مضامین میں انہوں نے اپنے ہم فن لوگوں کے کمالات اور کارناموں سے بحث کی ہے، اس سلسلہ کا پہلا مضمون علی گڑھ کے زولوجی ڈپارٹمنٹ کی خوبیوں اور خصوصیات پر ہے، جس سے خود شمیم صاحب بحیثیت طالب علم، لکچرر، ریڈر، پروفیسر اور چیرمین وابستہ رہے ہیں، پھر اس شعبہ سے وابستہ اور علم الحیوانیات کے آسمان پر آفتاب مہتاب بن کر چمکنے والے پروفیسر محمد بابر مرزا اور پروفیسر محمد عبدالبصیر خاں کے فضل وکمال کا تذکرہ ہے جو ''ذکر اس پری وش کا اور پھر بیان اپنا'' کے مصداق ہے، علی گڑھ ہی کے اسی ڈپارٹمنٹ کے دو اور لائق اشخاص بھی زیر بحث آئے ہیں، ان میں پروفیسر وجیہہ احمد نظامی جوہر قابل تھے مگر شعلۂ مستعجل نکلے، دوسرے ڈاکٹر رفیق احمد صدیقی اس وقت انگلینڈ کے افق پر ضوفشاں ہیں جن کے متعلق شمیم صاحب کے اس تبصرے وتجزیے پر نگاہ ٹھہر جاتی ہے:۔

''ریسرچ کے لئے جتنی محنت، سنجیدگی، جاں فشانی، سوجھ بوجھ اور حالات کی صحیح پرکھ میں

نے رفیق صاحب میں دیکھی اتنی میں نے بہت کم سائنس دانوں میں دیکھی ہے، ایک بات جس پر میں بھی یقین رکھتا ہوں وہ رفیق صاحب میں بھی ہے کہ جس مضمون کو ایک بار اختیار کرلیا، اس کا دامن پھر کبھی نہیں چھوڑا، گوکہ بدلتے ہوئے موسم کے ساتھ برسات کی پیداوار کی طرح بہت سے مضامین سامنے آتے ہیں لیکن عقل منداور اچھے سائنس داں وہی ہوتے ہیں جو ہر مضمون کے پیچھے نہیں بھاگتے بلکہ اختصاص پر توجہ دیتے ہیں، 'آج کچھ' اور 'کل کچھ' پر عمل کرنے والے سائنس داں اپنی پہچان بہت جلد کھودیتے ہیں، وہ نہ ادھر کے رہتے ہیں نہ اُدھر کے''۔ (ص ۲۶۷)

اسی فن سے متعلق دوسری یونیورسٹیوں سے وابستہ پروفیسر سید مہدی علی صاحب (جامعہ عثمانیہ حیدرآباد و مرہٹواڑا یونیورسٹی اورنگ آباد) اور پروفیسر گنپتی پرشاد شرما (چنڈی گڑھ یونیورسٹی) کا ذکر بھی ان کی فنی قابلیت و مہارت اور طبعی شرافت کی بنا پر کرکے شمیم صاحب نے اپنی بے تعصبی کا ثبوت دیا ہے۔

گو شمیم صاحب نے جن لوگوں کو موضوع سخن بنایا ہے، ان کی سیرت و شخصیت کا جوہر پیش کردیا ہے تاہم ان کے کمزور گوشے بھی ان کی نگاہ سے اوجھل نہیں رہے ہیں، اس کی ایک مثال پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، بصیر صاحب شمیم صاحب کے خاص استاد اور ممدوح ہیں، وہ ۱۹۶۲ء میں ریپبلکن پارٹی کے ٹکٹ پر یو۔ پی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے جو ان جیسے عالم و دانشور کے شایانِ شان نہ تھا، شمیم صاحب کا اس پر کرب ملاحظہ ہو:۔

''گوکہ ہم لوگ ان کے ساتھ ہی تھے لیکن حقیقت تو یہ تھی کہ ہم سب کو اس کی تکلیف تھی اور ہمارا دل رو رہا تھا، کیونکہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ایم ایل اے ہونا اور یو۔ پی اسمبلی میں جاکر بیٹھنا ان کی معراج نہیں تھی، اگر وہ خود کو میدان علم تک ہی محدود رکھتے تو ان کا مقام جو پہلے ہی بین الاقوامی سطح پر تھا مزید بالاتر ہوجاتا اور اس سے یونیورسٹی، ڈپارٹمنٹ اور ان کے شاگرد سب ہی فیض یاب بلکہ سیراب ہوتے''۔ (ص ۲۲۳)

کتاب کے آخری مضمون میں اردو اور اردو یونیورسٹی کی پیش رفت کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ مصنف کے غور و فکر کا نتیجہ اور گزشتہ چار پانچ برسوں کے تجربات کا نچوڑ ہے، یہ معلوماتی ہونے کے علاوہ سنجیدگی اور توجہ کا طالب ہے، اس میں ایک جگہ جامعہ عثمانیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ

علامہ شبلی اور حمید الدین فراہی جدید علوم کے بجائے اس کی صورت گری ایک مذہبی اور اسلامی یونیورسٹی کے طور پر کرنا چاہتے تھے، حالانکہ یہ دونوں حضرات نہ جدید علوم کی تعلیم کے خلاف تھے اور نہ ان کے لئے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے مخالف تھے البتہ مذہبی اور اسلامی علوم کو بھی اس یونیورسٹی کے نصاب میں شامل اور برقرار رکھنا چاہتے تھے، تاکہ جامعہ عثمانیہ کے پیش رو دارالعلوم حیدرآباد کی جس کے مولانا فراہی پرنسپل تھے اصل روح باقی رہے، مولانا سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں:۔

''مولانا حمید الدین صاحب نے اس مجوزہ درس گاہ میں ایک قدم اور آگے بڑھایا یعنی یہ کہ دینیات اور ادبیات کے علاوہ اس درس گاہ میں سارے علوم اردو میں پڑھائے جائیں، یہ بالکل نیا خیال تھا، اس لئے انہوں نے بڑی ہی مشکل سے ارکانِ حکومت کو اس کے لئے راضی کیا، اب الملطفی کی جگہ راس مسعود صاحب ناظم تعلیمات ہوئے، ان کے زمانے میں زمانہ نے نئی کروٹ لی، ایسی ایک مشرقی یونیورسٹی کے بجائے اس نے اردو کی ایک ایسی مغربی یونیورسٹی کا جامہ پہن لیا جس میں دینیات کی حیثیت ثانوی ہوگئی اور علوم مشرقیہ اس کا صیغہ ہوکر رہ گئے، بعض وجوہ سے مولانا حمید الدین صاحب دل برداشتہ ہوکر ۱۹۱۷ء (۱) میں استعفا دے کر چلے آئے اور عثمانیہ یونیورسٹی موجودہ صورت میں بن کر نمودار ہوئی جو گو وہ نہیں بنی جس کے بنانے کا خیال کیا گیا تھا لیکن پھر بھی اس نے وجود میں آکر ہندوستان کی تعلیمی دنیا میں ایک انقلاب برپا کردیا اور اس کے دینیات اور علوم مشرقیہ کا صیغہ اپنی تعلیم، طرز تعلیم، اساتذہ اور انگریزی و علوم جدیدہ کی آمیزش سے مولانا شبلی کے مرتبہ نقشہ کا اچھا خاصا خاکہ ہے''۔ (حیات شبلی ص ۵۱۵)

شمیم صاحب نے اپنے دادا مولانا اسلم کے منکرِ حدیث ہونے کی تردید کی ہے، مجھے اس سے اتفاق ہے لیکن ان کے دارالمصنفین نہ آنے اور دارالمصنفین کے اربابِ حل وعقد کے اعظم گڑھ میں ان کی قیام گاہ پر نہ جانے کی بات محتاج توضیح ہے، مولانا سید سلیمان ندوی سے ان کے بعض علمی اختلافات تھے، سید صاحب، مولانا عبد السلام ندوی اور مولوی مسعود علی ندوی مولانا اسلم جیراجپوری کے معاصر تھے، ان لوگوں کا مولانا سے ملنے کے لئے نہ جانا اور مولانا اسلم صاحب کا دارالمصنفین نہ آنا تو تسلیم شدہ ہے، لیکن شاہ معین الدین صاحب اور سید صباح الدین صاحب مولانا

---

(۱) استعفا کا صحیح سنہ ۱۹۱۹ء ہے۔

سے بہت چھوٹے تھے اور میں نے بعض واقف کاروں سے سنا ہے کہ یہ دونوں مولانا سے ملنے ڈاکٹر محمد معظم صاحب کے گھر جاتے تھے اور میں نے خود دونوں کو مولانا اسلم صاحب کا احترام سے ذکر کرتے ہوئے سنا ہے، صباح الدین صاحب پروفیسر مجیب صاحب کی نگرانی میں کسی علمی تحقیق کے سلسلے میں کچھ عرصے جامعہ ملیہ میں رہے، .... میں نے خود ان سے سنا ہے کہ وہ مولانا محمد اسلم صاحب کے یہاں بھی استفادے کے لئے جایا کرتے تھے، ایک بات اور قابل غور ہے، آپ نے لکھا ہے کہ ۱۹۴۶ء کے بعد آپ کے والد یعنی مولانا اسلم صاحب کے چھوٹے بیٹے ڈاکٹر محمد معظم نے اعظم گڑھ میں اپنا مطب شروع کیا، اس سے قبل وہ دہلی میں تھے، یہی زمانہ ہے جب مولانا سید سلیمان ندوی قاضی القضاۃ ہوکر بھوپال تشریف لے گئے تھے، اس لئے اس سے پہلے مولانا اسلم صاحب جب اعظم گڑھ آتے رہے ہوں گے تو یہاں رکنے کے بجائے سیدھے جیراجپور چلے جاتے رہے ہوں گے، ایسی صورت میں سید صاحب وغیرہ ان سے ملنے کہاں جاتے؟۔

مولانا عبدالسلام ندوی کے انتقال کے وقت مصنف کی عمر ۱۴ برس رہی ہوگی ، ایسی صورت میں انہوں نے مولانا کی خود فراموشی ، محویت اور استغراق کی جو توجیہہ بڑے جزم و وثوق سے کی ہے اسے قبول کرنا اور ان لوگوں کی بات رد کرنا جو لمبی عمر میں طویل عرصے تک مولانا کے ساتھ شب و روز رہے کیسے ممکن ہے؟۔

ایک ہی طرح کی بعض باتیں تقریباً ہر مضمون میں آگئی ہیں، اس تکرار سے اگر بالکل بچنا ممکن نہیں تھا، تب بھی کسی حد تک بچایا اختصار اور تخفیف سے کام لیا جاسکتا تھا۔

شمیم صاحب ایک ممتاز سائنس داں کی طرح واقعیت و حقیقت پسند ہیں، ان کے یہاں ادیب و انشا پرداز کی تخیل پسندی اور خیال آرائی نہیں ہے تاہم تحریر کی روانی ، بے ساختگی ، برجستگی اور آمد نے کتاب کی دل کشی اور دل آویزی بہت بڑھا دی ہے۔

کتاب کے آخر میں بیرون ملک کی بعض یونیورسٹیوں کے مشاہیر فضلا اور پشت کے ڈسک کور پر ملک کے بعض نامور اشخاص کے تاثرات درج ہیں، ان میں شمیم صاحب کی عظمت اور سائنس میں کمال کا اعتراف فراخ دلی سے کیا گیا ہے۔

"ض"

مطبوعات جدیدہ

ذکر فراہی از ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی متوسط تقطیع ، کتابت کمپیوٹر، کاغذ و طباعت عمدہ، صفحات ۸۴۰ مع گرد پوش قیمت ۳۵۰ روپے ۔ پتے (۱) دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح ، سرائے میر، اعظم گڑھ (۲) ادارۂ علوم القرآن پوسٹ بکس نمبر ۹۹ ، سرسید نگر ، علی گڑھ۔

ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہی شہرت اور نام و نمود سے بیزار تھے اس لئے اپنے فضل و کمال کے باوجود گمنام رہے، اگر ان کے تلمیذ رشید مولانا امین احسن اصلاحی ان کو علمی دنیا سے روشناس نہ کراتے اور ان کے افکار و علوم کی اشاعت نہ کرتے تو آج بہت کم لوگوں کو ہندوستان کے اس گم نام زمخشری کے نام اور ان کے کنز مخفی سے واقفیت ہوتی، ابھی تک مولانا کی کوئی مبسوط سوانح عمری نہیں لکھی گئی تھی، اب ان کے انتقال کے ۷۰ برس بعد ان کے حالات و سوانح کا یہ مرقع شائع ہوا ہے جو سنین پر مرتب کیا گیا اور اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے، شروع کے چار ابواب میں مولانا کے خاندان، شجرۂ نسب، جائے پیدائش، تاریخ پیدائش، نام، لقب، کنیت، نسبت اور تخلص وغیرہ کی تحقیق میں بڑی کدو کاوش کی گئی ہے، اس میں انصار مدینہ سے مولانا کا خاندانی تعلق اور علامہ شبلی سے ان کی قرابت قریبہ کا ذکر خاص طور پر آیا ہے۔ پانچویں باب میں مولانا کے بچپن، تحصیل علم اور بعض علمی و عملی سرگرمیوں، طبقات ابن سعد اور بدء الاسلام کے ترجمے وغیرہ کا تذکرہ ہے، چھٹا باب مولانا کے اساتذہ کے ذکر کے لئے خاص ہے، ساتویں باب میں مدرسۃ الاسلام کراچی میں تعلیمی خدمت انجام دینے اور وہاں کے قیام کے زمانے کے حالات و واقعات لکھے ہیں۔ اسی زمانے میں ان کا فارسی دیوان اور بعض تفسیری رسائل شائع ہوئے، جمہرۃ البلاغت مرتب کی، اسی باب میں ان کی زندگی کے دو اہم واقعات کی تفصیل بھی ہے، ایک تو جائداد کے ایک مقدمے میں ثالث کی حیثیت سے اپنے والد کے خلاف فیصلہ دینا، حالانکہ بعد میں یہ جائداد خود مولانا کو بھی ملتی، دوسرا لارڈ کرزن وائسرائے ہند کے خلیج فارس اور سواحل عرب کے سرکاری دورے میں ان کا ترجمان بن کر جانا، آٹھویں اور نویں باب میں علی گڑھ اور الٰہ آباد کے کالجوں کی ملازمت، تصنیف و تالیف کے اشغال اور اس دور کے بعض متفرق واقعات زیر بحث آئے ہیں۔ دسویں باب میں دارالعلوم حیدرآباد کی پرنسپلی اور قیام حیدرآباد کے واقعات مذکور ہیں، اسی زمانے میں علامہ شبلی کا انتقال ہوا اور مولانا کی سربراہی میں دارالمصنفین نے عملی شکل اختیار کی اور جامعہ عثمانیہ بھی قائم ہوا اور مولانا کی کوشش سے اس کا ذریعہ تعلیم اردو بنی۔ گیارہویں باب میں دارالعلوم کی پرنسپلی اور ہزار روپے مشاہرہ کو چھوڑ کر مدرسۃ الاصلاح کے بوریائے فقر پر فروکش ہونا، اپنے منفرد طرز تعلیم کو یہاں رواج دینا اور بعض اسفار و واقعات کی تفصیل ہے، بارہویں

باب میں وفات، متھرا میں تدفین اور تیرہویں باب میں اولاد و احفاد کا تذکرہ ہے، چودھواں باب تلامذہ و منتسبین کے لئے مختص ہے، اس میں ان کے فکر کے حاملین اور استفادہ کرنے والوں کی فہرست میں نیپال کے ولی عہد یوبراج جنگ بہادر رانا کا ذکر بھی ہے جو الہ آباد میں مولانا سے مشورۂ سخن اور اپنے فارسی کلام کی اصلاح لیتے تھے، پندرہواں باب مولانا کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ، مکمل و نامکمل تصانیف کے تعارف کے لئے مخصوص ہے، مطبوعہ تصانیف میں اس پر خاص توجہ کی ہے کہ ان کی طباعت کب کب اور کہاں کہاں ہوئی، غیر مکمل تصانیف میں دو چار ورق کی تحریروں کا ذکر بھی آگیا ہے۔ سولہواں باب قدرے طویل ہے، اس میں مولانا کی سیرت و اخلاق کے جلوے، عادات و معمولاتِ زندگی، لباس، طعام، دینی حمیت، شریعت کی پابندی، اتباع سنت اور دوسرے جزئی واقعات و حالات قلم بند ہیں۔

سترہویں باب میں مولانا فراہی اور ان کی تصنیفات کے بارے میں بعض عرب مصنفین اور مشاہیر ہند کے آرا و تاثرات درج ہیں، اٹھارہواں باب ''رواتِ فراہی'' پر ہے، اس میں ان لوگوں کا تذکرہ ہے جنھوں نے کتاب میں درج واقعات مصنف سے بیان کئے، لیکن اس میں اور دوسرے ابواب میں بھی رواۃ کے معاملے میں بڑی وسعت اور تعمیم سے کام لیا ہے، حالانکہ قوت و ضعف کے اعتبار سے راویوں کے درجے و مرتبے ہوتے ہیں، مصنف نے معتبر اور قوی راویوں ہی کے حوالے سے واقعات قلم بند نہیں کئے ہیں بلکہ رطب و یابس سب جمع کردیا ہے، ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ ''سر دست ہمارا مقصد ان راویات کو محفوظ کردینا ہے، جرح و تنقید اور محاکمہ کے لئے نہ وقت ہے نہ وسعت (ص ۶۷۸) حالانکہ بعض جگہ انہوں نے جرح و تنقید سے دریغ نہیں کیا، مدرسۃ الاصلاح کی تاریخ کے سلسلے میں انہوں نے بعض دیہاتی لوگوں کی ناقابلِ یقین روایتیں بلا نقد و جرح نقل کی ہیں اور قاضی اطہر مبارکپوری مرحوم کے بیان پر نقد کیا ہے، حالانکہ مدرسہ کی تاریخ کے باب میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا بدرالدین اصلاحی کے بیان پر قانع نہ ہو کر قاضی صاحب کا بیان نقل کرنا اور اسے اہمیت دینا اصولِ روایت کے منافی ہے، ایک اور جگہ مدرسہ سے ایک قادیانی ماسٹر کے اخراج کے متعلق تین روایتیں نقد و جرح کے ساتھ درج کی ہیں دوسری روایت کو جو مولوی نجم الدین اصلاحی کے واسطے سے ہے مصنف نے رنگ آمیزی اور اضافہ پر محمول کیا ہے۔ کم و بیش اسی کو راقم سے مولانا اختر احسن صاحب نے بیان کیا تھا، خود لائق مصنف کا خیال ہے کہ نصف صدی پیشتر کے واقعات اچھی طرح ذہن نشین نہیں رہ جاتے یا ایک ہی واقعہ اگر دس آدمی بیان کریں تو ہر ایک کے بیان میں کچھ نہ کچھ فرق و اختلاف لامحالہ ہوگا، اگر یہ فرق بنیادی نہ ہو تو قدر مشترک پر اکتفا کرلینا چاہئے اور اگر واقعی تضاد ہو تو حواشی میں اس کی صراحت کرکے اختصار سے کام لینا چاہئے، یہی نہ کرنے کی وجہ سے اس کتاب کی ضخامت بہت بڑھ گئی ہے، اس کتاب کی اصل خوبی یہ ہے کہ لائق مصنف مولانا کی عظمت و پایہ شناس اور ان کے معیار و مطمح نظر کی بلندی اور ابنائے زمانہ سے ان کے

تفوق سے آگاہ ہیں اور اس کا حسب موقع اظہار بھی کیا ہے، مولانا کے متقدم سوانح نگاروں کی بعض غلطیوں کی تصحیح مصنف کی تحقیق سے ہوئی ہے، مولانا سید سلیمان اور مولانا امین احسن نے مولانا کو الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر لکھا حالانکہ اس وقت تک اسے تدریسی یونیورسٹی کا درجہ ہی نہیں ملا تھا، مولانا کا تعلق میور سینٹرل کالج سے تھا، سید صاحب نے مولانا کے حیدرآباد چھوڑنے کی تاریخ ۱۹۱۷ء لکھی، صحیح سنہ ۱۹۱۹ء ہے، مولانا عبدالماجد دریابادی نے انہیں نظام کالج کا پرنسپل لکھا جب کہ وہ دارالعلوم کے پرنسپل تھے۔ مولانا نے اپنے معمول کے برخلاف سورۂ اخلاص کی تفسیر اردو میں اور دوسری تفسیروں سے مختلف طرز کی لکھی، مصنف کا یہ خیال بجا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تفسیر نظام القرآن کا جز نہیں۔ جن اشخاص کا ذکر کتاب میں آیا ہے ان پر تعارفی نوٹ ضرور ہونا چاہئے تھا، اعظم گڑھ کے متعدد اشخاص سے اب یہیں کے لوگ ناواقف ہیں تو دوسری جگہ کے لوگ بھلا ان سے کیا واقف ہوں گے، بیرونِ اعظم گڑھ کے لوگوں کے جاننے والے بھی اب کم ہی لوگ رہ گئے ہیں، سید محفوظ علی بدایونی (ص ۲۵۰) کو کتنے لوگ جانتے ہوں گے۔ سید صاحب نے مولانا کے درس سے پورا فائدہ اٹھانے والوں میں قابل ذکر نام صرف مولوی امین احسن صاحب کا لکھا ہے اور مولوی اختر احسن کا نہیں لکھا، اس کا موقع و محل کے لحاظ سے مقصد نہ سمجھنے کی وجہ سے مصنف نے رد و کد کی ہے، مقدمہ تفسیر نظام القرآن کے دیباچہ میں ان ہی سید صاحب نے مولوی اختر احسن صاحب کا ذکر پہلے کیا ہے۔ مولانا کی تصنیف امعان فی اقسام القرآن پر کئی تبصرے نقل کئے ہیں مگر اس میں مولانا وحید الدین خاں کا مخالفانہ تبصرہ نہیں شامل ہے جو الفرقان لکھنؤ میں شائع ہوا تھا۔ انگریزی اور عربی کے طویل اقتباسات کے اردو ترجمے کردئے گئے ہوتے تو ان کا فائدہ دوچند ہو جاتا، ص ۴۹۲ و ۴۹۳ پر مصنف نے اپنی طالب علمی میں درس کے دو واقعے لکھے ہیں لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ کون سی آیت اور حدیث تھی جن کے مفہوم کو سمجھنے میں اساتذہ نے غلطی کی تھی اور انہوں نے ان کا مطلب صحیح سمجھا تھا، ص ۵۵۹ پر یہ غلط لکھا ہے کہ حافظ ابراہیم مولانا آزاد کے بعد مرکزی وزیر تعلیم ہوئے تھے، بانی مدرسہ مولانا محمد شفیع کو ایک جگہ داناپوری لکھا ہے، داناپور میں انہوں نے تعلیم حاصل کی تھی، ص ۲۸۶ پر دارالعلوم کے بجائے دارالمصنفین لکھا ہے، یہ غلطی فہرست میں بھی ہے، کمپوزنگ میں ہ سے لکھے جانے والے الفاظ ہنوز، ہیئت، ہلالی، ہند، ہاؤس، دہندگان وغیرہ کو ھنوز، ھیئت اور ھلالی الخ لکھا ہے۔

تحقیق میں فروگزاشتوں کا ہونا مستبعد نہیں، اس سے کتاب کی قدر و قیمت کم نہیں ہوتی، یہ کتاب مصنف کا ایک بڑا اور شاندار کارنامہ ہے، ان کے علاوہ اتنا سارا مواد کوئی اور اکٹھا نہیں کرسکتا تھا، اس کے لئے انہوں نے جو محنت اور جانفشانی کی اور پاپڑ بیلے اس کی مثال نہیں ملے گی۔ ایک ایک گتھی کو سلجھانے اور ایک ایک مسئلہ کی چھان بین میں ان کو کئی روز لگے ہوں گے، بے سروسامانی کے باوجود ان کے شوق و ذوق، تلاش و جستجو اور ہمت و حوصلہ میں کمی نہیں آئی، ان کی دھن اور لگن کا یہ حال تھا

کہ جب وہ مواد کی تلاش میں سرگرداں تھے تو کوئی کتاب اور اخبار ہاتھ نہیں لگاتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر اس میں الجھا تو یہ کام نہیں ہو سکے گا، وہ اہل علم خصوصاً مولانا فراہی کے قدر دانوں کے شکریے اور مبارک باد کے مستحق ہیں، خدا کرے وہ کتاب کا دوسرا حصہ "فکر فراہی" بھی جلد مکمل کردیں جس کا اشتیاق بہت زیادہ ہے۔

سلاطین دہلی اور شریعت اسلامیہ ایک مختصر جائزہ

از ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، تقطیع اوسط، کاغذ، کتابت و طباعت، بہتر، صفحات ۱۳۶ مجلد مع گرد پوش قیمت ۵۷ روپے، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکٹ، علی گڑھ۔

ہندوستان خصوصاً سلاطین دہلی کا عہد اور اس کی تاریخ مصنف کی دلچسپی اور تحقیق و مطالعہ کا خاص موضوع ہے، اس کے متعلق اردو اور انگریزی میں ان کے مفید علمی مضامین برابر چھپتے رہتے ہیں اور بعض کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں، زیر نظر کتاب انکے چھ مضامین کا مجموعہ ہے جو چھ ابواب میں منقسم ہے، اس میں اسلامی قانون و شریعت سے سلاطین دہلی کی دلچسپی کا جائزہ کئی پہلوؤں سے لیا گیا ہے، پہلے باب میں اسلامی فقہ اور اس کے مسائل سے سلاطینِ دہلی کی واقفیت کے ان ذرائع کا ذکر ہے: علما و فقہاء سے استفسار، ان سے مسائل پر تبادلۂ خیال اور بحث و مذاکرہ کی مجالس کا انعقاد، اس کے علاوہ فقہی علوم کی اشاعت، فقہ و افتاء پر تصانیف اور ممتاز مصنفین فقہ کی سرپرستی کا ذکر بھی ہے، لائق مصنف نے اس دور کے کئی اہم مجموعہ فتاویٰ کے بارے میں مفید اطلاعات بہم پہنچائی ہیں، حکمرانوں کے احترامِ شریعت اور اسلامی قانون کی بالادستی کا قائل ہونے اور شرعی قانون کی ترویج و تنفیذ کی مثالیں دوسرے باب میں پیش کی گئی ہیں، موضوع کے دائرے سے باہر ہونے کی وجہ سے ان کے احکامِ شریعت کی خلاف ورزی کی مثالیں نہیں دی ہیں، تیسرے باب میں "سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات" مصنفہ پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم کی خوبیوں کا فراخ دلی سے اعتراف کرنے کے باوجود اس کے بعض کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کر کے اپنی حقیقت پسندی اور اس موضوع پر اپنی گرفت کا ثبوت دیا ہے، سلطان غیاث الدین بلبن کے یہاں شریعت کے احترام اور اسلامی قانون پر عمل پیرا ہونے کے علاوہ اس کے بالکل برعکس رجحان بھی ملتا ہے، مصنف نے ان دو مختلف رجحانات کا تجزیہ و تحلیل کر کے اس کے اصل اسباب بتائے ہیں، ایک باب میں نفاذ شریعت میں سلطان فیروز شاہ تغلق کی کوششیں بیان کی ہیں، اس میں سلطان کے فلاحی کاموں، انتظامی، معاشی اور معاشرتی اصلاحات، اباحیت پسندوں اور گمراہ صوفیہ و مشائخ کے خلاف اقدامات، کمزور طبقوں کی دادرسی اور غرباء پروری کا تذکرہ ہے، آخری باب میں جرائم کی سزاؤں کے بارے میں سلاطین کا رویہ زیر بحث آیا ہے، مصنف کے خیال میں انتظامی امور کی طرح اس میں بھی ان کی کوئی متعین پالیسی نہیں تھی۔ انہوں نے متعدد اہم سلاطین کے زمانے میں شریعت کی پابندی کی مثالیں پیش کی ہیں۔ کتاب کے آخر میں ایک ضمیمہ ہے اس سے ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کے نام اور زمانہ حکومت کا پتہ چل جاتا ہے، کتاب بڑی تلاش و محنت اور کدو کاوش کا نتیجہ اور مطالعہ کے لائق ہے۔ (ض)